ہندوستان کے محکمہائے تعلیم میں منظور شدہ
رسالہ
ادبی دنیا
نقشہ عالم کے متعدد ممالک تک ہندوستانیوں کے ساتھ اردو زبان پہنچ چکی ہے
India's Premier Magazine
The Adabi Dunya, Lahore.
ایڈیٹر: منصور احمد
PRICE
6 ANNAS.
قیمت چھ آنے

فہرست مضامین "ادبی دنیا"

جلد ۱۱ بابت ماہ اکتوبر ۱۹۳۴ء نمبر ۱

تصویر: تقدیر

سالانہ چندہ چار روپے سات آنے محصول اور وی پی نو آنے کل پانچ روپے ممالک غیر سے دس شلنگ

بزمِ ادب

ہندی اور اردو

جنوبی ہندوستان میں ہندی پرچارک تحریک کی عظیم الشان کامیابی کی وہ رپورٹ ہمیں موصول ہوئی ہے جو دکن بھارت ہندی پرچارک سبھا کے نئے دفاتر اور لائبریری کے افتتاح کے موقع پر ہندوستان بلڈنگ مدراس میں مسٹر سری نواس آینگر سابق جج ہائی کورٹ کے زیر صدارت ۲۲ ستمبر کو پڑھی گئی۔

اس رپورٹ کا خلاصہ یہ ہے:۔

جنوبی ہندوستان میں ہندی تحریک کی علمبردار دکن بھارت ہندی پرچارک سبھا مدراس ہے جس کی بنا مہاتما گاندھی نے ڈالی تھی۔ اس تحریک کو جو کامیابی حاصل ہوئی، خصوصاً گزشتہ پانچ سال کے دوران میں، وہ حیرت انگیز ہے۔

سرسری طور پر اندازہ لگایا گیا ہے کہ اس وقت چالیس ہزار آدمی ہندی پڑھنے میں مصروف ہیں اور تقریباً پینتیس ہزار طلبہ ہندی کے اُس امتحان میں شامل ہو چکے ہیں جس کا اہتمام سبھا مذکور کرتی ہے صرف اس سال کے امتحان دینے والوں کی تعداد تقریباً دس ہزار ہے اب تک تقریباً ۱۲۰۰ مرکز سبھا کے دائرۂ عمل میں آ چکے ہیں۔ اس وقت تقریباً ساڑھے چار سو ایسے مرکز قائم ہیں جہاں ہندی پڑھائی جاتی ہے۔ کئی ایک بورڈ ہائی سکولوں نے اور بہت سے پرائیویٹ سکولوں نے ہندی پڑھانے کا انتظام کیا ہے ....

ہندی پڑھنے والوں کے لئے سبھا نے آسانی پیدا کرنے کی خاطر نصاب کی موزوں کتابیں اور ایسی کتابیں تیار کی ہیں جن سے استاد کی مدد کے بغیر زبان سیکھنے میں مدد مل سکتی ہے۔ اب تک سبھا کی طرف سے ۶۵ قسم کی کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ اس وقت تک آٹھ لاکھ کتابیں فروخت ہو چکی ہیں۔

سبھا سال میں دو دفعہ تین ابتدائی امتحانات اور ایک ڈگری والا امتحان سال میں ایک مرتبہ منعقد کرتی ہے، جس کا نام "راشٹر بھاشا وشارد" ہے۔ اُن لوگوں کے لئے جو ہندی کے استاد بننا چاہیں یہ سبھا ایک ڈپلوما بھی دیتی ہے۔ سبھا کی کانووکیشن کے خطبات پچھلے بعد دیگرے مندرجہ ذیل حضرات نے پڑھے:۔ پروفیسر کاکا کیلکر از گجرات ودیاپیٹھ، پروفیسر ایم اے شاستری از میسور یونیورسٹی، پنڈت رام نریش ترپاٹھی از الہ آباد۔ ۱۹۳۳ء کی کانووکیشن میں خود مہاتما گاندھی صدر رہے۔

ہندی طلبہ کے لئے ایک رسالہ سبھا کی طرف سے شائع کیا جاتا ہے۔ اس رسالے کو نکلے بارہ سال ہو چکے ہیں۔

جنوبی ہندوستانیوں کے ہندی ذوق کی تسکین کے لئے سبھا نے چار ودیالے بیزواڈہ، مدورا، ارناکلم اور بنگلور کے صوبوں میں کھول رکھے ہیں۔

ہندی پرچارکوں کی تعلیم کے لئے سبھا نے مدراس میں ایک کالج جاری کر رکھا ہے جہاں مفت تعلیم اور اقامت کا انتظام ہے۔ اب تک جو لوگ یہاں سے فارغ التحصیل ہو کر نکلے ہیں ان کی تعداد تین سو کے قریب ہے۔

سبھا ایک رجسٹرڈ انجمن ہے جس کا انحصار عوام کی امداد پر ہے۔ اپنے ذرائع سے سبھا کو جو آمد ہوتی ہے وہ بمشکل اُن شعبہ جات کو کفایت کرتی ہے جو اس نے جاری کر رکھے ہیں۔ باقی مصارف چندوں اور نذرانوں سے پورے کئے جاتے ہیں۔

اب اردو کی حالت پر نظر ڈالئے تو زمین و آسمان کا فرق نظر آئیگا۔ یہاں انجمنیں بہت ہیں، کتابیں اور رسالے بھی نسبتاً زیادہ چھپتے ہیں، درسگاہیں بھی کچھ کم نہیں، لیکن چونکہ تنظیم مفقود ہے اس لئے کوئی کام بھی کما حقہ انجام پذیر نہیں ہوتا۔ ہندوستان کی سب سے بڑی انجمن، انجمنِ ترقی اردو ایک اعلیٰ درجے کی کتاب شائع کرتی ہے تو دوسری دفعہ اس کے چھپنے کی نوبت کم ہی آتی ہے۔ رسالے نکلتے ہیں، چند روز زندہ رہ کر بند ہو جاتے ہیں۔ درسگاہوں میں ایسی کتابوں کے بجائے جو زبان سنواریں ایسی کتابیں رائج ہیں جو زبان بگاڑ دیتی ہیں۔ کاش اردو کے علمبردار ہندی کی تنظیمی ترقی کو سبق لیں اور اپنے کاموں میں مرکزیت پیدا کریں۔

سالنامہ "ادبی دنیا"

اس وقت تک جن ادبائے ملک کے مضامین سالنامے کے لئے موصول ہوچکے ہیں! ان میں سے چند نام درج ذیل ہیں

نظمیں

حضرت جوش ملیح آبادی
حضرت آزاد انصاری
جناب سید احمد حسین صاحب امجد حیدرآبادی
مولانا جلال الدین اکبر
جناب سید عبدالحمید صاحب عدم
جناب لالہ تلوک چند صاحب محروم بی۔اے
پروفیسر سید عابد علی صاحب عابد ایم اے
حضرت فراق گورکھپوری
حضرت حفیظ ہوشیارپوری
ملک عطاءاللہ صاحب کلیم ایم اے

افسانے

پروفیسر ایشور چندر نندا ایم اے (ایک مکمل ڈراما)
مولانا شاہد احمد صاحب ایڈیٹر ساقی دہلی (ایک ایکٹ کا ڈراما)
جناب نور الٰہی محمد عمر صاحبان
جناب محترمہ زیب صاحبہ
جناب سید بادشاہ حسن صاحب حیدرآبادی

علمی و ادبی مضامین

جناب مولانا سید حسن صاحب برنی
جناب سید ذوالفقار عظیم صاحب بی اے
حضرت نسیم رضوانی

جن بلند پایہ ادبا کے مضامین موصول ہونے کی توقع ہے۔ ان میں سے چند نام یہ ہیں:۔

حضرت آغا حشر کاشمیری
جناب منشی پریم چند صاحب
پروفیسر سید فیاض محمود صاحب ایم اے
حضرت خواجہ حسن نظامی صاحب
پنڈت برج موہن صاحب کیفی دتاتریہ
مولانا منظور سرورش صاحب بھوپالی
پروفیسر موہن سنگھ صاحب دیوانہ ایم اے
میرزا عظیم بیگ صاحب چغتائی بی اے ایل ایل بی
میرزا فہیم بیگ صاحب چغتائی
حضرت آرزو جلیلی

ہیڈ ماسٹر صاحبان کے نام

ہمارے منیجر صاحب نے مدارس کے ہیڈ ماسٹر صاحبان کے نام مندرجۂ ذیل پیغام دیا ہے جسے ہم بجنسہٖ درج کرتے ہیں۔

حضرات:۔ ادبی دنیا کا عظیم الشان سالنامہ دسمبر میں شائع ہوگا۔ دسمبر میں "ادبی دنیا" کا عام نمبر بھی شائع ہوگا۔ سالنامہ عام نمبر سے بالکل علیحدہ چیز ہوگا اور تمام خریداروں کو بذریعہ وی پی بھیجا جائے گا۔ چونکہ آپ میں سے بعض صاحبان پرچہ بذریعہ وی پی وصول نہیں کرتے بلکہ بل طلب فرمایا کرتے ہیں۔ اس لئے استدعا ہے کہ بواپسی ڈاک اس امر کی اجازت دیں کہ آپ کو سالنامہ بھیج دیا جائے۔ اور بل سالقہ ارسال کر دیا جائے۔ سالنامہ کی قیمت ڈیڑھ روپیہ سے زیادہ نہیں ہوگی۔ خاکسار منیجر

دلگیر مرحوم

حضرت حاجی سرحدی جن کا کلام "ادبی دنیا" میں چھپتا رہتا ہے۔ تاریخ گوئی میں اس وقت ہندوستان بھر میں اپنا نظیر نہیں رکھتے۔ وہ نظم و نثر میں فی البدیہہ تاریخ کہتے ہیں۔ دلگیر مرحوم کے انتقال پر انہوں نے ہماری طرف چونتیس مختلف مصرعہائے تاریخ لکھ کر بھیج دیئے تھے قلت گنجائش کی وجہ سے ہم یہاں صرف نوحہ درج کر رہے ہیں اگر دلگیر مرحوم کے اعزہ چاہیں تو وہ تاریخیں ان کی خدمت میں پیش کی جا سکتی ہیں

نوحہ و تاریخ وفات دلگیر اکبرآبادی مرحوم

ہر اک نفس سے نمایاں ہے موت کی تلقین | مگر یہ درس حیات ابد ہے رکھو یقین
نہیں حیات میں کوئی سکون قلب کی شکل | خیال مرگ ہو ملتی ہے کچھ مگر تسکین
جو کارنیک زمانے میں کر گیا کوئی | اسی کے واسطے ہوتی ہے ہر طرف تحسین
جو کچھ ہے دار فنا میں فلک کے واسطے ہے | رہیں گے باغ کے جلوے نہ بزم کی تزئین
یہ امتیاز و تعین ہے سب فنا کے لئے | رہے غرور ہی باقی نہ فخر اور تسکین

ہے دل میں ولولۂ موت موجزن حاجی
عروس مرگ دکھاتی ہے شکل نو تزئین

۳۴ ۱۹ منصور احمد

آئینۂ عالم

صحافت کی تعلیم کا انتظام

کلکتہ یونیورسٹی تجویز پر غور کر رہی ہے

انجمنِ اخبار نویسانِ ہند کے ایما پر کلکتہ یونیورسٹی صحافت کی تعلیم کا انتظام کرنے کی تجویز پر غور کر رہی ہے۔ ایک عرصے سے تعلیم یافتہ نوجوانوں کی خواہش رہی ہے کہ وہ صحافت کو بحیثیت پیشے کے اختیار کریں۔ لیکن انہیں اس کی مناسب تعلیم کے لئے بڑی مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ بلاشبہ بہت سے طلبہ اخبارات کے دفتروں سے جا کر کام سیکھتے ہیں لیکن جو تھوڑی بہت تعلیم وہ وہاں حاصل کرتے ہیں مکمل نہیں کہی جا سکتی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جب ضرورت پڑتی ہے تو بہترین آدمی نہیں ملتے۔ نہ بہترین آدمی اس پیشے کی طرف رجوع کرتے ہیں اور نہ بہترین آدمیوں سے صحافت کو کوئی فایدہ پہنچتا ہے۔

اخبار نویس کے لئے نہ صرف یہ لازم ہے کہ اس کی عام تعلیم نہایت اعلیٰ ہو، اسے تاریخ اقتصادیات، سیاسیات اور جدید خیالات، افراد اور اشیا کے متعلق علم ہو، بلکہ اسے ہندوستانی اور غیر ہندوستانی صحافتی تاریخ اور صحافتی کام کے ہر پہلو پر عبور حاصل ہونا چاہیئے، اور اس کے کاروباری انتظام، پریس بھیجنے کے لئے کاپی کی تیاری، خبروں کے ساتھ تصویروں کے استعمال، خبروں کے انتخاب، اشتہارات کی نمایش غرض کہ کسی روزانہ یا ماہوار پرچے کی تیاری میں جن جن منازل سے بھی گذرنا پڑتا ہے اُن سب سے اسے واقفیت ہونی چاہیئے۔

انگلستان، ریاستہائے متحدہ امریکا اور دوسرے ممالک میں صحافت کی تعلیم کے لئے مدارس اور کالج کھلے ہوئے ہیں جہاں سے سیکڑوں، نوجوان ہر سال اس اہم پیشے کی تعلیم حاصل کر کے نکلتے ہیں لیکن بدقسمتی سے ہندوستان میں ابھی تک ایسی کوئی درسگاہ قایم نہیں ہوئی۔ کچھ عرصے سے انجمن اخبار نویسانِ ہند کی توجہ خاص طور پر اس مسئلے کی طرف مبذول ہو رہی ہے۔ انہوں نے بڑی محنت سے ایک سکیم تیار کر کے کلکتہ یونیورسٹی کے سامنے پیش کی۔ لیکن خبر نہیں کن وجوہ کی بنا پر اس کا کچھ نتیجہ برآمد نہ ہوا۔ مگر جب سے مسٹر شیام پرشاد مکرجی وائس چانسلر کے عہدے پر فائز ہوئے ہیں انجمنِ مذکور نے اُن سے اس اہم مسئلے پر گفت و شنید کی ہے۔ چنانچہ انہوں نے انجمن کا ایک وفد اس موضوع پر بحث کرنے کے لئے طلب کیا ہے۔ چونکہ کسی معقول فنڈ یا حکومت کی مدد کے بغیر صحافت کا ایک علیحدہ شعبہ قایم کرنا خارج از بحث معلوم ہوتا ہے اس لئے انجمن نے فیصلہ کیا ہے کہ وائس چانسلر سے استدعا کی جائے کہ وہ ایم اے کے تاریخ اور اقتصادیات کے نصاب میں صحافت کو ایک اختیاری مضمون کی حیثیت سے شامل کر لیں۔ چنانچہ وہ تجویز جو نیچے درج کی جا رہی ہے وائس چانسلر اور سنڈیکیٹ کے ملاحظہ کے لئے پیش کر دی گئی ہے۔

انجمنِ اخبار نویسانِ ہند کا خیال ہے کہ اس محدود شکل میں بھی صحافت کی تعلیم کی طرف طلبہ کی کثیر تعداد کھنچ آئے گی، کیونکہ صحافت میں خدمتِ عامہ کے ساتھ ساتھ شہرت، معاشرتی حیثیت اور عزت کے بڑے بڑے امکانات پوشیدہ ہیں۔

نصابِ صحافت میں مندرجۂ ذیل مضامینِ مطالعہ انجمن نے تجویز کئے ہیں:۔

۱۔ تاریخِ صحافت، درون و بیرون ہند میں۔

۲۔ بانیانِ صحافتِ موجودہ۔

۳۔ عملی صحافت۔

(۱) آئینِ صحافت

(ب) روزانہ اخبار کی پیدائش کی داستانیں۔

(ج) صحافتی تحریر۔
(د) خبریں جمع کرنا اور تقسیم کرنا۔
(ہ) صحافت کے اصول اور اقسام۔
(و) مبادیاتِ جغرافیہ ——— سیاسی اور اقتصادی۔
(ز) مدنیت و شہریت، جس میں مقامی، صوباجاتی اور مرکزی حکومتیں قومیت اور بین الاقوامیت، مسائل اقلیت اور انجمن اقوام کے موضوعات بھی شامل ہوں گے۔
۴۔ شمار و اعداد، کتبِ معلومات اور ان کے استعمال کا طریقہ۔
۵۔ قانونِ صحافت ——— حقوق، توہین، بغاوت، نقصان وغیرہ
۶۔ مصور صحافت ——— عکسی تصویریں، خاکے اور کارٹون۔
۷۔ فنِ اشتہار سازی و اشتہار بازی
امید کی جاتی ہے کہ اگر ابھی سے نہیں تو آیندہ سال سے صحافت کی تعلیم کلکتہ یونیورسٹی میں شروع ہو جائے گی۔

جرمن شرعِ ازدواج کے دس احکام

جرمن ریش کونسل نے صحتِ عامہ کے لئے "جرمن شرعِ ازدواج کے دس احکام" کے نام سے ایک اعلان ہزاروں کی تعداد میں شائع کیا ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ جرمنی میں نسلی پروپیگنڈا کن کن طریقوں سے ہو رہا ہے۔

۱۔ یاد رکھو کہ تم ایک جرمن ہو۔
نوجوان جرمنوں کو آگاہ کیا جاتا ہے کہ ان کی زندگیاں قوم کی ملکیت ہیں اور اس لئے ان کے ہر عمل کے مدِ نظر قوم کا مفاد ہونا چاہئے۔
۲۔ اگر تمہاری صحت اچھی ہے تو ضرور شادی کرو۔
جو کچھ بھی تم ہو، تمہاری خصوصیات، تمہارا جسم اور تمہاری روح تمہارا ورثہ ہیں جو تمہیں اپنے آبا و اجداد سے تحفۃً ملے ہیں۔ تم نسلوں کی مسلسل زنجیر کی ایک کڑی ہو۔ اس زنجیر کو مت توڑو۔
۳۔ اپنے جسم کو پاک صاف رکھو۔
قوم کی خدمت کے لئے اس صحت کی حفاظت کرو جو تمہیں اپنے والدین سے حاصل ہوئی ہے۔ لسّان عورتوں سے فضول باتوں میں وقت مت گنواؤ۔ جو کچھ تم ان سے چاہتے ہو اپنے آپ سے چاہو۔ یاد رکھو کہ تم آیندہ قوم کے جرمن آبا و اجداد ہو۔
۴۔ اپنے قلب اور روح کو پاک رکھو۔
نوجوان مرد اور عورتوں کو آگاہ کیا جاتا ہے کہ وہ اپنی فطرتوں کو اجنبی اثر سے محفوظ رکھیں۔
۵۔ ایک جرمن کی حیثیت سے تمہیں اپنا رفیقِ زندگی اپنی نسل یا نارڈی نسل سے انتخاب کرنا چاہئے۔
اس حکم کے بعد ایک لمبی تقریر ہے جس میں جرمن نسل کو آمیزش سے بچانے کی اہمیت کو واضح کیا گیا ہے۔
۶۔ رفیقِ زندگی کا انتخاب کرتے وقت اس کے حسب و نسب کے متعلق تحقیقات کر لو۔
تم صرف اپنے رفیق سے شادی نہیں کرتے بلکہ اس کے پیشروؤں سے بھی شادی کرتے ہو۔ اچھی اولاد صرف اچھے گھرانوں سے پیدا ہو سکتی ہے۔
عقل و دانش بھی اسی طرح ورثے میں ملتی ہے جس طرح رنگ بال اور آنکھیں۔
ممکن ہے کہ ایک اچھے آدمی کی فطرت میں ایسے برے جراثیم موجود ہوں جو اس کی اولاد کے لئے مہلک ثابت ہوں۔ اس لئے کسی برے خاندان کے اچھے آدمی سے شادی نہ کرو۔
اپنے رفیق کے آبا و اجداد کی صحت میں شک ہونے پر ہر ہونے والے شوہر اور بیوی کو لازم ہے کہ وہ اپنے رفیق کی صحت کے متعلق حکومت کے ماہرین سے رائے حاصل کرے۔
۷۔ ظاہری حسن کے لئے صحت پہلی شرط ہے۔
نوجوان جرمنوں کو چاہئے کہ شادی کرنے سے پہلے طبی معائنہ کرا لیا کریں۔
۸۔ صرف محبت کے لئے شادی کرو۔
شادی کرنے والوں کو معلوم ہونا چاہئے کہ دولت مسرت کا بدل نہیں ہو سکتی۔
لیکن اپنی محبت کو اندھا نہ ہو جانے دو۔ اپنی آنکھوں کو روشن کرو اور ذمہ دار بنو۔ عقل و ہوش کھو دینا محبت نہیں ہے۔

۹۔ اپنی زندگی کے رفیق تلاش کرو تکمیل کے رفیق نہیں۔
شادی کوئی وقتی کھیل نہیں ہے جسے دو آدمی کھیلا کریں بلکہ ایک مستقل عہد ہے جس کے افراد اور اقوام کے لئے گہرے معنی ہوتے ہیں۔
۱۰۔ شادی کے معنی صحت و اولاد ہے۔
قوم اپنی ہستی کو برقرار رکھنے کے لئے تم سے کم از کم تین یا چار بچے چاہتی ہے۔ تمہارے جتنے زیادہ بچے ہوں گے تمہارے خاندان کی اتنی ہی خصوصیات کا اظہار ہوگا۔
تم اس دنیا سے رخصت ہو جاؤ گے لیکن جو کچھ تم اپنے بال بچوں میں منتقل کر جاؤ گے وہ باقی رہے گا۔ ان کی ذات میں تم زندہ رہو گے۔ تمہارا خاندان ہمیشہ کے لئے زندہ رہے گا۔

ہندوستانی ناموں کے انگریزی تلفظ

ایک انگریزی اخبار لکھتا ہے:۔
ہم لوگوں کو ہندوستانی ناموں کا تلفظ کرنے میں جو دقت پیش آتی ہے اسے دیکھ کر ہمارے ایک ہندوستانی نامہ نگار نے بہت لطف اٹھایا ہے، اور جس احسن طریقے سے ہم اس مشکل پر غالب آئے ہیں اس سے وہ اور بھی محظوظ ہوا ہے، کیونکہ ہمارے وضع کردہ نام ہندوستانی دوستوں سے ہمارے لگاؤ اور ہماری محبت کے آئینہ دار ہیں۔
ہمارے لئے یہ سخت دشوار ہے کہ ہم شری رنجیت سنگھ جی بہادر جیسا نام یاد رکھ سکیں۔ اس لئے ہم اس کے بجائے "رنجی" کہہ لیتے ہیں۔ نہ ہمارے لئے اس شاندار کھلاڑی کے شاندار بھتیجے راجکمار دلیپ سنگھ جی بہادر کا نام یاد رکھنا کچھ آسان ہے اس لئے ہم نے اسے مختصر کر کے صرف دلیپ بنا لیا ہے۔ نواب پٹودی کہنے کی بجائے ہم نے ان کو "پیٹ" کا سیدھا سادھا آرش نام دے دیا ہے۔ جب ہمارا جہ راج پیپلا حال ہی میں ڈربی کی دوڑ جیت گئے تو ان کے گرد ہزاروں لوگ "شاباش پیپ" کے نعرے لگاتے ہوئے جمع ہو گئے۔

کچھ دن گذرے ہندوستانی طلبہ کی ایک جماعت کو ان کے انگریز دوستوں نے اپنے گھروں پر دعوتیں دیں۔ میزبان خواتین نے اپنے مہمانوں کے نام یاد رکھنے کی ہزار کوشش کی لیکن بے سود ثابت ہوئی۔ آخر تنگ آ کر انھوں نے محمد ایوب کو "جاب" اور غلام محی الدین کو "آیوڈین" کہنا شروع کر دیا۔ پھر ساتھ کے طلبہ بھی پیچھے نہیں رہے اور انہوں نے بھی ان کو انہیں ناموں سے پکارنا شروع کر دیا اور غالباً وہ بے تکلف حلقے میں اب اسی نام سے مشہور ہوں گے۔

مذہب ریڈیو سے بالاتر ہے

ڈاکٹر جے ایچ ریجینلڈ ڈکسن نے جو لنکاسٹر کے گرجا کے آرگنسٹ ہیں ایک بحث کے دوران میں کہا آلاسلکی کے ذریعے عبادت نہ ہو سکے گی اور گرجے خالی ہو جائیں گے۔ تم نشر الصوت کے ساتھ روح کو شامل نہ کر سکو گے نہ روح کی بلند ترین خواہشات کو ــ اور نماز تو اسی کو کہتے ہیں۔
اگرچہ دعا کے الفاظ ایک آلۂ نشر الصوت کے اندر بولے جا سکتے ہیں لیکن اس کی نسبت یہ قیاس نہیں کیا جا سکتا کہ اس میں خدا بیٹھا ہماری آواز کو سن رہا ہے۔
جب کوئی شخص خدا کی طرف متوجہ ہوگا تو اس آلہ کی تمام خصوصیات اس کے ذہن میں زندہ ہو کر اس عبادت میں مخل ہوں گی اور اس کی توجہ کو برباد کر دیں گی۔ سو ایسی عبادت کو حقیقی مت سمجھو حقیقی عبادت نشر نہیں کی جا سکتی۔

ترکی میں خاندانی ناموں کا رواج

ترکی میں طویل کاوش کے بعد ایک قانون ترتیب دیا گیا ہے جس کے رو سے تمام ترکوں کو اپنے نام کے ساتھ ایک خاندانی نام اختیار کرنا پڑے گا۔ انگورہ کی مجلس ملی نے اسے موجودہ اجلاس کے اختتام سے پہلے ہی منظور کر لیا ہے۔
اس کے یہ معنی ہیں کہ ایک سال سے پہلے پہلے ہر ترکی گھرانے

نفرت!

جرمنی کے مشہور شاعر، تمثیل نگار، ناقد، افسانہ نگار "پال ہیس" کا یہ افسانہ نہ صرف اس کے افسانوں میں بہترین ہے بلکہ جرمن ادب میں اس کی خاص جگہ ہے۔ میرے خیال میں اردو کا ایسے افسانہ سے محروم رہنا قابلِ افسوس ہے۔ لہٰذا اس کا ترجمہ خاص "ادبی دنیا" کے لئے روانہ کر رہا ہوں۔

(تمنائی)

بمشکل ابھی صبح ہوئی تھی۔ کوہا سے کا دھندلا بادل، ویسو ویس پہاڑ پر چھایا ہوا شہر نیپلس تک پھیلا ہوا تھا۔ ساحل کے کنارے بسے ہوئے چھوٹے چھوٹے گاؤں بھی اندھیرے میں تھے۔ سمندر ساکن تھا۔

خلیج سورنتو کے کناروں پر ماہی گیر اور ان کی عورتیں اپنے روزمرہ کے کام شروع کر چکی تھیں۔ کوئی موٹے موٹے رسّوں سے کشتی کو خشکی کی طرف کھینچ رہا تھا، کوئی جال ڈال رہا تھا۔ کوئی بادبان چڑھا رہا تھا، کوئی پتوار لئے چلا آ رہا تھا۔ غرض کوئی ہاتھ بھی خالی نہ تھا۔ بڑے بوڑھے بھی جنہوں نے سمندری زندگی ترک کر دی تھی اپنے بچوں کو جال کھینچنے میں مدد دے رہے تھے۔ یہاں وہاں مکان کی چھت پر بوڑھی عورتیں سوت کات رہی تھیں یا بچوں کی ـــــ اپنے نواسوں اور پوتوں کی ـــــ خبر گیری کر رہی تھیں کیونکہ ان کی مائیں اپنے شوہروں کو مدد دینے ساحل پر گئی ہوئی تھیں۔

ایک بوڑھیا نے اپنی پوتی سے کہا۔ "دیکھتی ہو رشیلا! وہ ہیں ہمارے پادری صاحب۔ انتونیو انہیں اپنی کشتی میں کاپری لے جائے گا لیکن اُن کی آنکھیں نیند کے خمار سے اب تک بھاری ہو رہی ہیں۔"

اس نے ہاتھ اٹھا کر یہیں سے اپنے پادری کو سلام کیا۔ پادری اپنی قمیص کا دامن سمیٹ کر کشتی میں بیٹھ گیا۔ سب لوگ اپنے پادری کو رخصت کرنے کے لئے کام چھوڑ کر کھڑے ہو گئے تھے۔ پادری نے دائیں بائیں سر کے اشارے سے سب کا سلام لیا۔

ننھی لڑکی نے سوال کیا۔ "پادری صاحب کاپری کیوں جا رہے ہیں؟ دادی! کیا وہاں کے لوگوں کا کوئی پادری نہیں جو ہمارے پادری کو قرض لیتے ہیں؟"

دادی نے کہا۔ "پگلی! پادری تو بہت سے ہیں لیکن وہاں ایک امیر عورت بیمار ہے۔ پہلے وہ یہیں رہتی تھی۔ اُس وقت بھی بیمار ہوئی تھی اور ہمارے اسی پادری کی دعا سے اچھی ہوئی تھی۔ یہاں سے جاتے وقت اس نے پادری کو کلیسا کو اور یہاں کے غریبوں کو بہت کچھ دیا تھا لوگ تو کہتے ہیں کہ وہ جاتی ہی نہ تھی حتیٰ کہ ہمارے پادری نے وعدہ کر لیا کہ وہ ہمیشہ اس سے ملنے اور اس کے اعترافات سننے جایا کرے گا۔"

یہ کہہ کر بڑھیا نے ایک مرتبہ پھر پادری کو ہاتھ ہلا کر سلام کیا کیونکہ اس کی کشتی اب روانہ ہونے کو تھی۔

"موسم کیسا رہے گا بیٹا؟" پادری نے متفکرانہ نگاہوں سے نیپلس کی طرف دیکھتے ہوئے انتونیو سے پوچھا۔

نوجوان ملاح نے جواب دیا۔ "ابھی سورج نہیں نکلا ہے یہ تمام بادل سورج نکلتے ہی چھٹ جائیں گے۔"

"تو جلدی کرو! دھوپ سے پہلے ہی نکل چلیں۔"

انتونیو نے پتوار لیا مگر اچانک رک گیا۔ سورنتو سے آتی ہوئی سڑک پر اس کی نظریں جم گئیں۔ ایک لمبی نازک، نسوانی شکل تیزی سے بڑھی چلی آ رہی تھی اور رومال ہلا ہلا کر اشارے کر رہی تھی۔

اس کی بغل میں ایک گٹھڑی تھی۔ وہ معمولی لباس پہنے تھی لیکن اس کا سر ایک خاص مغرورانہ انداز سے پیچھے کی طرف جھکا ہوا تھا۔ بالوں کی گھنگھریالی لٹیں پیشانی پر لٹکی ہوئی تھیں۔

"اب انتظار کیا ہے؟" پادری نے سوال کیا۔

"ایک اور شخص کاپری جانا چاہتا ہے ـــــ بشرطیکہ آپ اجازت

دیں۔ ذرا ابھی دیر نہ ہو گی نہ کشتی ہی آہستہ چلنے گی۔ وہ ایک لڑکی ہے ابھی اٹھارہ برس کی بھی نہیں ہے!"

پادری پہچان کر بولا "لاریلا! اسے کاپری میں کیا کام ہے؟"

انتونیو نے اپنے کاندھے ملائے۔ لڑکی تیزی سے بڑھتی چلی آ رہی تھی۔ اس کی نظریں سامنے تھیں۔

"آخاہ! غصہ در پری، صبح بخیر!" ایک دو نوجوان ملاح چیخے

اگر پادری وہاں نہ ہوتا تو وہ کچھ اور بھی کہتے۔ جس صبر سے تیوری پر بل ڈال کے اس نے مذاق سنا اور برداشت کیا ملاحوں کی طبیعت اور للچا گئی۔

پادری نے کہا "لاریلا! کیسی ہو؟ ہمارے ساتھ کاپری چلتی ہو؟"

"اگر مقدس باپ کی اجازت ہو"

"انتونیو سے اجازت لے لو کشتی اس کی ہے۔ ہر آدمی اپنی چیز کا مالک ہے اور خدا ہم سب کا مالک ہے!"

لاریلا نے ملاح کی طرف دیکھے بغیر کہا "یہ میرے پاس چھ پیسے ہیں اگر کرایہ کو کافی ہوں!"

"مجھ سے زیادہ تمہیں ان کی ضرورت ہے" انتونیو نے جواب دیا اور نارنگی کی ٹوکریاں ہٹا کر جگہ بنانے لگا۔ وہ جزیرہ میں نارنگیاں لے جا کر بیچا کرتا تھا۔

لاریلا نے اپنی سیاہ بھنویں سکیڑ کر کہا "لیکن میں مفت تو نہ جاؤں گی"

پادری نے کہا "آ بیٹی! انتونیو اچھا لڑکا ہے وہ تیرے پیسوں سے امیر ہونا نہیں چاہتا۔ آ چلی آ" پادری نے سہارا دینے کو لڑکی کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ "بیٹھ جاؤ دیکھو اس نے تیرے لئے اپنا جیکٹ بچھا دیا ہے۔ سب جوان ایک ہی طرح کے ہوتے ہیں۔ اٹھارہ سال کی ایک چھوٹی لڑکی کے لئے اتنا کرتے ہیں جتنا دس پادریوں کے لئے بھی نہیں کرتے ـــــ نہیں نہیں انتونیو معذرت کی ضرورت نہیں یہ خدا کی مرضی ہے کہ جنس جنس کی طرف جھکے"۔

اس اثنا میں لاریلا کشتی میں آ بیٹھی تھی۔ اس نے پہلے انتونیو کی جیکٹ ہٹا دی اور پادری کے نزدیک بیٹھ گئی۔ انتونیو منہ ہی منہ میں کچھ بولا اور کشتی روانہ ہوئی۔

پادری نے پوچھا "اس گٹھڑی میں کیا لئے جا رہی ہو؟" وہ اب کھلے سمندر میں آ چکے تھے جس کی نیلی سطح کو آفتاب کی پہلی کرنوں نے منور کرنا شروع کر دیا تھا۔

"ریشم دھاگا اور روٹی۔ ریشم جزیرے میں ایک فیتہ بنانے والی بڑھیا خریدے گی اور دھاگا ایک دوسری!"

"دھاگا تو تم نے خود کاتا ہو گا"

"جی ہاں"۔

"مجھے یاد پڑتا ہے کہ تم نے فیتہ بُننا بھی سیکھا تھا"

"ہاں لیکن اماں کی بیماری نے مجھے گھر سے نکلنے ہی نہیں دیا کہ اس کی اچھی طرح مشق کرتی۔ خود ہمارے پاس آنا روپیہ نہیں کہ بننے کی مشین خرید سکیں"۔

کیا پہلے سے حالت زیادہ خراب ہے؟ ـــــ پچھلی دفعہ جب میں نے اسے دیکھا تھا تو وہ ذرا اچھی تھی"۔

"یہ موسم انہیں ہمیشہ تکلیف دیتا ہے پچھلے طوفان اور زلزلے کے بعد سے تو وہ بالکل بستر سے لگ گئیں"۔

دعا کر بیٹی! کبھی نماز سے غافل نہ ہو۔ دعا سے باز نہ آ۔ شاید کنواری مریم تیری سفارش کریں۔ محنتی اور نیک بن تاکہ تیری دعائیں قبول ہوں"۔

چند لمحے کی خاموشی کے بعد:۔

ابھی جب تم ساحل کی طرف آ رہی تھیں میں نے سنا کہ ملاح تجھے "غصہ ور" کے لقب سے پکار رہے تھے یہ کیوں! یہ لقب تو ایک مسیحی دوشیزہ کے لئے جسے حلیم اور خوش مزاج ہونا چاہئے کچھ اچھا نہیں"۔ دوشیزہ کا گندمی چہرہ غصے سے تمتما اٹھا اس کی آنکھیں چمک اٹھیں۔

"وہ اسی طرح مجھے چڑاتے ہیں کیونکہ میں اور لڑکیوں کی طرح ناچتی گاتی اور ان سے ہنسی مذاق نہیں کرتی۔ مجھے وہ کیوں پریشان کرتے ہیں؟ میں نے تو ان کا کچھ بگاڑا نہیں"۔

"ہاں لیکن تم مہذب تو ہو سکتی ہو۔ جن کے لئے زندگی آسان ہے انہیں ناچنے گانے دو۔ لیکن مصیبت زدوں سے کم از کم میٹھی بات تو ممکن ہے"۔

دوشیزہ کی آنکھیں جھک گئیں گویا اسے اندیشہ تھا کہ کہیں یہ اس کا راز افشا نہ کر دیں۔

کچھ دیر تک خاموشی رہی۔ پہاڑی سلسلے کے اوپر چمکیلا آفتاب نظر آ رہا تھا۔ ولسو دیس کی چوٹی البتہ اب تک بادلوں میں چھپی ہوئی تھی۔ سورنتو کی خلیج کے چھوٹے چھوٹے سفید مکان نارنگی کے سبز سبز باغوں میں سے دکھائی دے رہے تھے۔

پادری نے پوچھا "اس مصور کے بارے میں پھر تجھے کوئی خبر

ملی لاریلا! وہ بے چارہ تجھ سے شادی کرنے کا کتنا خواہشمند تھا۔"

لاریلا نے سر ہلایا۔

"تیری تصویر اتارنی چاہتا تھا۔ تو نے انکار کر دیا!"

"میری تصویر کیوں اتارنا چاہتا تھا! مجھ سے زیادہ خوبصورت لڑکیاں موجود ہیں کون جانتا ہے میری تصویر لے کر وہ کیا کرتا! شاید جادو کرتا، میری روح کو تکلیف دیتا۔ مجھے قتل کر ڈالتا، میری ماں کہتی تھی۔"

پادری نے خلوص سے کہا "یہ گناہ کی باتیں ہیں بیٹی! کیا تو خدا کی امان میں نہیں جس کے حکم کے بغیر تیرا ارداں تک نہیں ہل سکتا! تو کیا ایک بے چارہ فانی انسان ایک تصویر لے کر تجھ پر غالب آسکتا ہے! پھر وہ تو تجھ سے محبت بھی کرتا تھا ورنہ شادی کی درخواست کیوں کرتا!"

لڑکی کچھ نہ بولی۔

"تم نے انکار کیوں کر دیا! لوگ کہتے ہیں وہ بڑا شریف تھا ۔۔۔۔ اور روپیہ بھی تیری اور تیری ماں کی خبرگیری کرتا ۔۔۔۔ جتنا تو ریشم بُن بُن کر کر سکتی ہے اس سے زیادہ!"

لڑکی نے متاثر ہو کر کہا "ہم لوگ بڑے غریب ہیں۔ میری ماں مدت سے بیمار ہے۔ ہم اس پر بوجھ ہو جاتے۔ پھر میں ایک بیگم بننے کے لائق بھی نہیں۔ جب اس کے دوست آتے وہ شرمندہ ہوتا!"

"تم کیسی باتیں کیا کرتی ہو! میں کہتا ہوں وہ بہت اچھا آدمی تھا، شاید وہ تمہارے ساتھ سو رنج ہی رہ جاتا۔ ایسا شوہر شاید ہی تمہیں ملے۔ خدا نے اسے خاص تمہارے لئے بھیجا تھا!"

"میں شوہر نہیں چاہتی ۔۔۔۔ میں کبھی شادی نہیں کروں گی۔"

لاریلا نے آہستہ مگر فیصلہ کن انداز سے کہا

"کیا تم نے قسم کھائی ہے؟ یا رہبانیت اختیار کرنے کا ارادہ ہے!"

اس نے سر کے اشارہ سے انکار کیا۔

لوگ غلط تو نہیں کہتے کہ تو ضدی ہے! کیا تو نے کبھی غور کیا ہے کہ تو دنیا میں بالکل اکیلی ہے۔ تیری ضد ماں کی زندگی تلخ کرنے والی ہے۔ کیا تیرے پاس کوئی وجہ بھی ہے کہ تو ایسے آدمی کو جس نے تجھے اور تیری ماں کو مدد دینے کے لئے ہاتھ بڑھایا تھا رد کر دیتی! لاریلا جواب دے!"

اس نے آہستہ سے رکتے ہوئے کہا "میرے پاس وجہ ہے۔

لیکن بتاؤں گی نہیں!"

"نہیں بتائے گی، مجھے نہیں بتائے گی! میں جو تیرا پادری ہوں۔ تو خوب جانتی ہے۔ تیرا خیرخواہ ہوں ۔۔۔۔ یا نہیں لاریلا!"

لاریلا نے سر ہلا کر اقرار کیا۔

"تو بیٹی مجھے اپنے دل کی باتیں بتا۔ اگر وجہ معقول ہوگی تو سب سے پہلے میں ان کی تائید کروں گا تو ابھی کم سن ہے، اس دنیا سے بے خبر! ایک زمانہ آئے گا جب تجھے اپنی ضد سے ایسا زریں موقع کھو دینے کا سخت افسوس ہوگا!"

لاریلا نے شرمائی ہوئی نظریں کشتی کے دوسرے کنارے کی طرف اٹھائیں جہاں انتونیو بیٹھا تیزی سے ڈانڈ چلا رہا تھا۔ اس کی نگاہیں دُور سمندر سے پرے افق پر جمی ہوئی تھیں اور وہ اپنے خیالات میں غرق تھا۔

پادری نے دوشیزہ کو اُدھر دیکھتے ہوئے دیکھا اور اپنا کان اس کے قریب کر دیا۔

"آپ میرے باپ کو تو نہیں جانتے!" لڑکی نے آنکھوں میں عجیب طرح کی چمک پیدا کر کے پوچھا!

"تیرا باپ! تو تو ابھی دس ہی برس کی تھی کہ خدا نے اس کو بلا لیا۔ آسمان کی بادشاہت میں اسے جگہ ملے، تیری اس ضد سے تیرے باپ کو کیا واسطہ!"

"آپ نہیں جانتے۔ آپ کو نہیں معلوم۔ میری ماں کی بیماری کا سبب وہی ہے۔"

"کیسے؟"

"اپنی بدسلوکی سے، وہ اسے مارتا اور سخت اذیت دیتا تھا۔ مجھے وہ راتیں یاد رہیں گی جب وہ جنون کی حالت میں گھر آتا، میری ماں ایک لفظ بھی منہ سے نہ نکالتی اور اس کے ہر حکم کی تعمیل کرتی۔ مگر پھر بھی وہ اسے مارتا اتنا کہ میرا دل دکھ اٹھتا۔ میں اپنا منہ دونوں ہاتھوں سے ڈھانک لیتی اور سونے کا بہانہ کر لیتی۔ لیکن میں پڑی تمام رات روتی رہتی۔ جب پھر وہ بے حال ہو کر گر پڑتی تو وہ یکایک بدل جاتا۔ دوڑ کر اسے اٹھاتا اور سینے سے لگا کر بھینچ بھینچ کر اتنا پیار کرتا کہ میری ماں گھبرا اٹھتی! میری ماں مجھے ہمیشہ منع کرتی کہ کسی سے اس کا ذکر نہ کروں۔ جب سے وہ مرا ہے یہ بھی بیمار ہو گئی ہے۔ اور اگر ۔۔۔۔

خدانخواستہ ——— مرگئی تو میں جانتی ہوں کہ اس کا قاتل کون ہوگا۔"

پادری سرہلانے لگا۔ کچھ سمجھ میں نہ آتا تھا کہ اس عجیب منطق کی کیا توجیہ کرے اور اسے کیسے قائل کرے۔

بالآخر اس نے کہا۔ "اپنے باپ کو معاف کردو جیسے تمہاری ماں نے اسے معاف کردیا ہے۔ پرانی باتوں کی تکلیف دہ یاد کو بھلا دو۔ مستقبل میں تمہارے اچھے دن آئیں گے جو ماضی کا رنج مٹا دیں گے۔"

اس نے جھرجھری لے کر کہا۔ "میں کبھی نہیں بھول سکتی! یہی وجہ ہے کہ میں نے عمر بھر تنہا رہنے کا ارادہ کر لیا ہے۔ میں کسی مرد کی لونڈی نہیں بنوں گی جو پہلے مجھے مارے اور پھر پیار کرے! اگر ہو تو صورت میں مجھے کوئی مارے یا پیار کرے تو میں اس سے نبٹ سکتی ہوں لیکن میری ماں نہ اس کی مار کا مقابلہ کرسکتی تھی نہ پیار کا، کیونکہ وہ اس سے محبت کرتی تھی۔ میں کسی مرد سے ایسی محبت نہیں کروں گی جو بیمار کردے یا اذیت پہنچائے"!

"تو ابھی بالکل بچہ ہے اور ایسی باتیں کرتی ہے جن سے معلوم ہوتا ہے کہ زندگی کے متعلق تجھے کچھ واقفیت نہیں کیا سب مرد تمہارے باپ ہی کے سے ہیں؟ کیا سب اپنی بیویوں کے ساتھ ایسا ہی سلوک کرتے ہیں؟ کیا تو نے کبھی کوئی اچھا آدمی نہیں دیکھا؟ یا ایسی خوش نصیب بیویاں جو اپنے شوہروں کے ساتھ آرام و اطمینان سے رہتی ہیں"؟

"لیکن میرے ماں باپ کا حال بھی کون جانتا ہے؟ انہیں بھی لوگ خوش قسمت خیال کرتے ہیں۔ میری ماں مرجانا پسند کرتی مگر اس کی شکایت اسے پسند نہ تھی۔ اس لئے کہ اسے محبت تھی۔ اگر محبت یہی ہے، اگر محبت ہماری زبان گونگی کر دیتی ہے کہ ہم کچھ بول نہ سکیں، اگر محبت میں صرف تکلیف ہی سہنی پڑتی ہے تو میں کسی مرد سے محبت نہ کروں گی۔"

"میں نے کہہ دیا تو بالکل بچہ ہے۔ تجھے خود خبر نہیں تو کیا کہہ رہی ہے جب وقت آجائے گا تیری رائے نہیں پوچھی جائے گی کہ آیا تو محبت کرنا پسند کرتی ہے یا نہیں"؟

پادری نے ذرا ٹھہر کر پھر سوال کیا۔ "کیا مصر بھی تمہارے خیال میں سنگ دل ہی تھا"؟

اس کی نظریں بالکل ویسی ہی تھیں جیسی میرے باپ کی اس وقت ہوجایا کرتی تھیں جب وہ میری ماں کو اٹھا کر پیار کرتا اور اس کی خوشامد کرتا تھا۔ وہ نظریں میں خوب پہچانتی ہوں آہ مرد ایسی نظروں سے دیکھتا بھی ہے اور پھر اپنی بے قصور بیوی کو مارتا بھی ہے۔ مجھے ایسی نظروں کو دیکھ کر سخت جلن ہونے لگتی ہے"!

اس کے بعد وہ کچھ نہیں بولی۔ پادری بھی خاموش ہوگیا۔ اسے بہت سے ایسے اقوال اب یاد آچکے تھے جن سے وہ اسے قائل کرسکتا تھا لیکن وہ چپ رہا کیونکہ گیفنگوسن کر نوجوان ملاح کے چہرے سے غصے کا اظہار ہورہا تھا۔

دو گھنٹے کے بعد کشتی کاپری کی گھاٹ پر پہنچ گئی۔ انتونیو نے پادری کو گود میں اٹھا لیا اور ٹخنے ٹخنے پانی میں چل کر اسے خشکی پر اتار دیا لیکن لاریلا نے اس کے واپس آنے کا انتظار نہ کیا۔ ایک ہاتھ میں گھڑی لی، دوسرے سے گٹھڑی اٹھائی اور اچھلتی کودتی ساحل پر پہنچ گئی۔

پادری نے انتونیو سے کہا "میں کاپری میں کچھ دیر ٹھہروں گا۔ انتظار کی ضرورت نہیں ——— شاید میں کل سے پہلے نہ لوٹ سکوں۔ لاریلا گھر جا کر اپنی ماں کو میرا سلام کہہ دینا۔ اسی ہفتے میں اسے دیکھنے آؤں گا۔ رات سے پہلے واپس چلی جاؤ گی نا"؟

لڑکی نے اپنے کپڑے درست کرتے ہوئے جواب دیا۔ "اگر ممکن ہوا۔"

"بے پروائی کا انداز پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہوئے انتونیو بولا۔ لیکن مجھے لوٹنا ضرور ہے۔ میں شام تک انتظار کروں گا۔ اگر تم نہ آئیں تو میں جلد چلا جاؤں گا"!

پادری نے تنبیہہ کہا۔ "تم ضرور واپس آجانا! لاریلا" رات بھر ماں کو اکیلا چھوڑنا مناسب نہیں۔ کیا تمہیں دور جانا ہے"؟

انا کاپری کے پاس انگوروں کے باغ میں"!

"اور مجھے کاپری جانا ہے۔ جاؤ خوش رہو میری بچی ——— اور تم بھی میرے بیٹے"!

لاریلا نے پادری کا ہاتھ چوما۔ اور اس طرح "خدا حافظ" کہا کہ ملاح بھی مخاطب تھا لیکن انتونیو نے اس میں اپنا کچھ حصہ نہ خیال کیا۔ ٹوپی اٹھا کر لاریلا کی طرف دیکھے بغیر اس نے پادری کو سلام کیا لیکن جب دونوں روانہ ہوگئے تو کچھ دیر تک وہ پادری کی طرف دیکھتا رہا اور پھر فوراً ہی اس نے اپنی نظروں کو لاریلا کے تعاقب میں دوڑا دیا لاریلا نے

دائیں طرف مڑ کر، دھوپ سے بچنے کے لئے آنکھوں پر ہاتھ رکھ کے بلندی پر چڑھنا شروع کر دیا تھا۔ وہ جیسے تھک کر رک گئی اور مڑ کر دیکھنے لگی۔ اس کے سامنے وسیع سمندر پھیلا ہوا تھا۔ اس کی نیلگوں چمک اس وقت تک اپنی بہار دکھا رہی تھی۔ اس کے چاروں طرف صاف دُھلی ہوئی چٹانیں سر اٹھائے کھڑی تھیں۔ عجیب منظر تھا۔ لیکن اتفاقاً اس کی نظریں انتونیو کی نظروں سے، جو اس کا تعاقب کر رہی تھیں جا لڑیں۔ بیک وقت دونوں نے ایسی جنبش کی گویا انھوں نے کوئی غلطی کی ہے۔

لاریلا نے جھنجھلا کر تیزی سے اپنا راستہ لیا۔۔۔۔۔۔۔

دوپہر ڈھلے ایک گھنٹہ ہو گیا۔ انتونیو کو ماہی گیروں کے شراب خانے میں بیٹھے دو گھنٹے گذر گئے۔ وہ ازحد متفکر معلوم ہوتا تھا۔ بار بار اٹھتا اور جزیرے کے دونوں شہروں کو جاتی ہوئی سڑکوں پر نظر ڈال کر چلا آتا۔ اسے موسم کا کچھ اعتبار نہ تھا۔ کیا خبر کہ رات تک موسم بدل جائے؟

"کیا یہاں سیاح بہت آتے ہیں؟" شراب خانے کی مالکہ نے اس سے پوچھا۔

"ابھی تو آنا شروع ہوئے ہیں۔ اب تک موسم ہی خراب تھا!" انتونیو نے جواب دیا۔

"اب کی بہار بھی دیر میں آئی۔ تمہارے یہاں کیا اس جزیرے سے زیادہ آمدنی ہے"؟

انتونیو نے کہا "پیٹ بھی نہ بھرتا اگر کشتی نہ ہوتی۔ کبھی کبھی کوئی خط جزیرے میں پہنچانے کو مل جاتا ہے۔ کبھی کوئی شوقین مزاج مچھلی کے شکار کے لئے مجھے طلب کرتے ہیں۔ لیکن میرا چچا نارنگی کے کئی باغوں کا مالک ہے وہ کہا کرتا ہے کہ جب تک میں زندہ ہوں تجھے کوئی تکلیف نہ ہوگی۔ مرتے وقت بھی تجھے نہ بھولوں گا!"

"اس مالدار چچا کے اولاد بھی ہے؟" عورت نے سوال کیا

انتونیو نے کہا "نہیں" اس نے شادی ہی نہیں کی۔ دوسرے ملکوں میں رہ کر کافی دولت جمع کر لی ہے۔ وہ عنقریب ہی مچھلی کی تجارت بڑے پیمانے پر کرنے والا ہے۔ اس کا انتظام میرے ہی سپرد ہوگا!"

"انتونیو! تمہاری قسمت تو کھل گئی!"

"زندگی کا بوجھ سب کے لئے ہے!" نوجوان ملاح نے شانہ ہلا کر کہا اور باہر نکل کر تمام راستہ اور آسمان دیکھنے لگا۔ حالانکہ اسے خوب معلوم تھا کہ موسم معلوم کرنے کے لئے ہر طرف دیکھنے کی ضرورت نہیں

عورت نے پوچھا "ایک بوتل اور لاؤں؟ تمہارا چچا قیمت تو ادا کر ہی دے گا!"

"بس اب نہیں! کاپری کی شراب بہت تیز ہے۔ ایک گلاس کو سر چکرا گیا!"

"لیکن یہ خون کو نہیں گرماتی۔ تم جتنی چاہو پی سکتے ہو ——— ایلو میرے شوہر بھی آگئے۔ بیٹھو، ان سے باتیں کرو"۔

جتنے میں عورت کاپری کی خالص شراب کی دوسری بوتل لائی کسی کے قدموں کی چاپ سنائی دی۔ بائیں طرف والی سڑک سے لاریلا آرہی تھی۔

انتونیو تیزی سے کھڑا ہو گیا۔ لاریلا آکر کچھ متردد سی کھڑی ہو گئی۔

انتونیو نے شراب خانے کے مالک اور مالکہ سے کہا "یہ خاتون سورنتو سے صبح پادری کے ساتھ آئی تھیں اور انہیں رات سے قبل اپنی بیمار ماں کے پاس پہنچنا ہے"۔

شراب خانے کے مالک نے کہا "اچھا اچھا! رات کو ابھی کافی دیر ہے! بیگم، ایک گلاس اور لاؤ"!

لاریلا نے دور ہی سے کہا "شکریہ میں تو اس وقت نہیں پیتی!"

"لاؤ۔ لاؤ! انہیں تھوڑے سے اصرار کی ضرورت ہے"!

انتونیو نے سمجھایا "خدا کے لئے چھوڑ دیجئے! یہ بڑی ضدی لڑکی ہے کوئی اس کے ارادے کو بدل نہیں سکتا!"

——— اور پھر وہ چشم زدن میں اپنی کشتی پر تھا۔ اس نے رسی کھول دی اور انتظار کرنے لگا۔ لاریلا نے سر کے اشارے سے عورت کو سلام کیا اور آہستہ آہستہ کشتی کے قریب پہنچ گئی۔ اس نے چاروں طرف دیکھا، شاید کسی مسافر کی امید میں! لیکن گھاٹ بالکل خالی تھا! ماہی گیر سو رہے تھے یا کنارے پر جال ڈال رہے تھے عورتیں بھی ——— اکا دکا ——— دروازوں میں بیٹھی جال بننے میں مصروف تھیں۔

چاروں طرف دیکھنے کا اسے زیادہ موقع نہ ملا۔ قبل اس کے کہ لاریلا اسے روک سکے انتونیو نے اسے گود میں اٹھا کر کشتی پر لا بٹھایا ——— گویا وہ کوئی چھوٹا سا بچہ تھی!

کشتی روانہ ہوگئی!

لاریلا کشتی کے بالکل ایک کنارے جا بیٹھی۔ اور اس نے اپنی

پشت کو اتنا گھمایا کہ اب انتونیو اس کا آدھا چہرہ دیکھ سکتا تھا۔ اس کے چہرے سے غیظ و غضب کا اظہار ہو رہا تھا۔ اس کی سیدھی بھنویں سکڑ گئی تھیں۔

کچھ دُور خاموشی سے جانے کے بعد اس نے آفتاب کی تپش محسوس کی۔ اس نے گٹھڑی کھول کر رومال سر پر رکھ لیا اور روٹی کھانے لگی۔ کیونکہ کاپری میں اس نے کچھ نہیں کھایا تھا۔

انتونیو اب چپ نہ رہ سکا۔ اس نے ٹوکری سے دو نارنگیاں نکال کر بڑھا دیں۔

اس نے کہا "لاریلا روٹی ان کے ساتھ کھاؤ۔ یہ نہ سمجھنا کہ میں نے یہ نارنگیاں تمہارے لئے بچا رکھی تھیں۔ یہ ٹوکری سے گر گئی تھیں۔ شہر سے لوٹنے پر یہ مجھے نظر آئیں"۔

لیکن انتونیو اس وقت سچ نہ بول رہا تھا۔

"تم ہی کھاؤ۔ میرے لئے روٹی کافی ہے"۔

"اس گرمی میں نارنگی اچھی ہوتی ہے تم بہت چل کر آئی ہو"۔

"میں پانی پی چکی ہوں"۔

"اچھا تمہاری مرضی"۔ ملاح نے یہ کہا اور نارنگیوں کو کشتی میں میں ڈال دیا۔

خاموشی!

سمندر شیشے کی طرح شفاف تھا۔ موجیں سوئی ہوئی تھیں۔ سفید آبی چڑیاں بھی اپنے شکار کا تعاقب بے آواز پرواز سے کر رہی تھیں!

انتونیو نے پھر سلسلۂ گفتگو شروع کیا "تم اپنی ماں کے لئے نارنگیاں لیتی جاؤ"!

"گھر پر نارنگیاں ہیں اور جب وہ ختم ہو جائیں گی تو میں اور خرید سکتی ہوں"۔

"انھیں بھی لے جاؤ نا۔ میرے سلام کے ساتھ اپنی ماں کو دینا"۔

لاریلا نے جھنجھلا کر کہا "وہ تمہیں نہیں جانتی"۔

"تم بتا دینا"۔

"میں بھی تو تمہیں نہیں جانتی"۔

یہ پہلا موقع نہ تھا کہ لاریلا نے اس سے تجاہل برتا تھا۔ گذشتہ سال ایک اتوار کو جب مصور پہلی بار گاؤں میں آیا تھا۔ انتونیو اس وقت اپنے دوستوں کے ساتھ گیند کھیل رہا تھا۔

وہیں پر مصور نے لاریلا کو پہلی بار دیکھا تھا وہ سر پر گھڑا لئے بغیر اس کی طرف دیکھے گذر گئی تھی۔ مصور اس کے حُسن و جمال سے مبہوت کھڑا رہ گیا تھا اور اسے یہ بھی خیال نہ رہا تھا کہ وہ کھیل کے درمیان کھڑا ہے۔ ایک گیند اس کی پسلی میں اس زور سے آ کر لگی کہ وہ اپنے خیالات سے چونک پڑا۔ گویا اسے بتایا جا رہا تھا کہ تم غلط جگہ پر کھڑے ہو گیند پھینکنے والا انتونیو کے سوا اور کوئی نہ تھا۔

کئی ہفتے بعد جب لاریلا نے شادی کی درخواست نامنظور کر دی تو مصور نے کہا تھا "کیا تم میری درخواست کو اس بدتہذیب چھوکرے کی وجہ سے رد کرتی ہو؟" مگر لاریلا نے تیز ہو کر کہا تھا "میں تو اسے جانتی بھی نہیں"۔

حالانکہ وہ گیند کے واقعے سے واقف ہو چکی تھی اور انتونیو کو اچھی طرح جانتی تھی۔

اور اِس وقت دونوں ایک ہی کشتی میں بیٹھے تھے۔ دو دشمنوں کی طرح۔ دونوں کے دل زور زور سے دھڑک رہے تھے۔

انتونیو کا ہنس مکھ چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔ وہ اتنی زور سے پتوار چلا رہا تھا کہ چھینٹیں اڑ اڑ کر لاریلا پر پڑ رہی تھیں! ساتھ ساتھ اس کے ہونٹ ہل رہے تھے، گویا غصہ میں کچھ بڑبڑا رہا ہو!

لاریلا اس طرح بیٹھی تھی گویا اسے دیکھ ہی نہیں رہی ہے۔ بڑی بے پروائی سے کشتی کے کنارے پر جھکی ہوئی ہاتھ دریا میں ڈالے پانی سے کھیلتی جا رہی تھی۔ پھر اس نے سر کا رومال کھول ڈالا اور بالوں کو درست کرنے لگی۔ گویا کوئی اور وہاں موجود ہی نہیں۔ اس کی بھنویں سکڑی ہوئی تھیں! اس نے اپنے جلتے ہوئے گالوں پر بھیگے ہوئے ہاتھ رکھے۔

کشتی انہیں کھلے سمندر میں لے آئی۔ جزیرہ بہت دور پیچھے تھا اور ساحل سامنے، دور! قرب و جوار میں کوئی اور کشتی نہ تھی ۔۔۔۔ خاموشی میں خلل ڈالنے کو کچھ نہیں!

انتونیو نے چاروں طرف دیکھا جیسے کوئی عزم صمیم کر رہا ہو۔ اس کے چہرے کا رنگ غائب ہو گیا۔ اس نے پتوار چھوڑ دیا۔

لاریلا نے بلا ارادہ اس کی طرف دیکھا ۔۔۔۔ بے خوف، لیکن متوجہ!....

انتونیو بول اُٹھا "اب فیصلہ ہو جانا چاہیئے۔ یہ کھیل بہت ہو چکا تعجب ہے میں اب تک مر کیوں نہیں گیا۔ تم کہتی ہو مجھے نہیں جانتیں حالانکہ برابر دیکھتی رہی ہو کہ پاگلوں کی طرح تمہارے پیچھے پیچھے پھرتا ہوں کہ تم سے اپنے دل کی باتیں کہوں!... لیکن تم نفرت سے منہ پھیر لیتی ہو"!

اس نے پیشانی پر بل ڈالتے ہوئے پوچھا "لیکن میں تم سے کیا کہتی! میں دیکھتی تھی کہ تم مجھ سے تعارف پیدا کرنا چاہتے ہو لیکن میں بے وجہ لوگوں کی چہ میگوئیوں کا نشانہ بننا نہیں چاہتی۔ میں تمہیں اپنا شوہر بنانا نہیں چاہتی —— نہ کسی اور کو!"

"نہ کسی اور کو!... تم ہمیشہ ایسا نہیں کہو گی۔ ابھی تم اس لئے ایسا کہہ رہی ہو کہ مصور تمہیں پسند نہیں۔ ابھی تم بچہ ہو۔ آیندہ کسی نہ کسی کو شوہر بناؤ گی ضرور!"

لاریلا نے سنجیدگی سے کہا "کون جانتا ہے مستقبل کی کسے خبر ہے! ہو سکتا ہے کہ میں اپنا خیال بدل دوں۔ تمہیں اس سے کیا؟"

"مجھے کیا!" انتونیو نے چیخ کر کہا اور کھڑا ہو گیا۔ کشتی ادھر ادھر جھکنے لگی۔ "تم پوچھتی ہو مجھے کیا؟ خوب جانتی ہو! سن لو! میں کہتا ہوں جس شخص کو بھی تم مجھ پر ترجیح دو گی میرے ہاتھوں سے اُسے سخت اذیت اٹھانی پڑے گی۔ اس کی جان جائے گی"!

"تو کیا میں نے تم سے کوئی وعدہ کیا ہے؟ اگر تم پاگل ہو جاؤ تو اس میں میرا کیا قصور ہے؟ تمہارا مجھ پر کیا حق ہے"؟

ملاح نے جوش سے چلا کر کہا "آہ! میرا حق کہیں لکھا ہوا نہیں ہے کسی وکیل نے وثیقہ نہیں بنایا، کسی حاکم کی مہر اس پر نہیں لیکن میں محسوس کرتا ہوں کہ مجھے تم پر اتنا ہی حق ہے جتنا آسمان (بہشت) میں مجھے حاصل ہے اگر میں مسیحیت پر مروں۔ کیا تم سمجھتی ہو کہ میں تمہیں دوسرے آدمی کے ساتھ گرجا جاتے دیکھوں گا اور چپ رہوں گا؟ کیا مجھے یہ پسند آئے گا کہ لڑکیاں مجھے دیکھ کر انگشت نمائی کریں"؟

"تمہاری جو مرضی ہو کرو۔ میں ان دھمکیوں سے ڈرتی نہیں۔ میرے بھی جو جی میں آئے گا کروں گی"!

انتونیو غصہ سے کانپ اٹھا

"میں اب تمہیں ایسا نہ کرنے دوں گا۔ تم جیسی ضدی لڑکی کو میں اپنی زندگی برباد نہ کرنے دوں گا۔ یاد رکھو تم میرے بس میں ہو تمہیں میرا حکم ماننا پڑے گا"!

وہ چونک سی پڑی لیکن اس کی آنکھیں اسے دلیری سے دیکھ رہی تھیں!

اس نے بڑے اطمینان سے کہا "اگر ہمت ہو تو مار ڈالو!"

"میں جو کہتا ہوں وہی کرتا ہوں"! انتونیو کی آواز بھرا گئی۔ "یہاں سمندر کی تہ میں ہم دونوں کے لئے جگہ ہے۔ لڑکی! تو میرے بس میں نہیں ہے" —— اس نے آخری الفاظ اس طرح کہے جیسے خواب میں ہوا! حسرت کی جھلک کے ساتھ! —— "لیکن ہمیں ایک دوسرے کے ساتھ چلنا چاہیئے! ساتھ! اور فوراً!" اس نے چیخ کر یہ کہا اور اسے اپنے بازوؤں میں جکڑ لیا۔ لیکن فوراً ہی تیزی سے اپنا ہاتھ کھینچ لیا۔ خون کا فوارہ چھوٹ نکلا۔ لاریلا نے بڑے زور سے کاٹ کھایا تھا۔ لاریلا نے قہقہہ مار کر کہا "مجھے تیرا حکم ماننا پڑے گا!" —— اور انتونیو کو دھکیل کر دور ہٹا دیا۔

"یہاں میں تیرے اختیار میں ہوں!" یہ کہہ کر وہ سمندر میں کود پڑی اور نظروں سے غائب ہو گئی۔

وہ پانی کے اوپر نمودار ہوئی اس کے کپڑے جسم سے چمٹ گئے تھے بال موجوں کے تھپیڑوں سے کھل گئے تھے اور اس کی لمبی گردن سے لپٹے ہوئے تھے۔ وہ بڑی مہارت سے پیر رہی تھی۔ اس نے کوئی لفظ نہیں کہا۔ وہ کشتی سے دور ہونے لگی۔ ساحل کی طرف جانے لگی۔

اچانک خوف سے انتونیو سناٹے میں آ گیا وہ بت بنا اسے دیکھ رہا تھا۔ اس کی نظریں حیران تھیں۔ گویا اس نے ابھی ابھی کوئی معجزہ دیکھا تھا۔

آخر کار جب اس کے حواس بجا ہوئے تو اس نے ڈانڈا اٹھائی اور پوری قوت سے اس کے پیچھے کشتی لے چلا۔ کشتی اس کے خون سے رنگین ہوتی جا رہی تھی!...

لاریلا بڑی تیزی سے جا رہی تھی مگر کشتی جلد ہی اس کے نزدیک پہنچ گئی۔

اس نے چلا کر کہا "کنواری مریم کا واسطہ کشتی پر آ جاؤ! میں پاگل ہو گیا تھا خدا جانے کس چیز نے میرا دماغ بالکل تاریک کر دیا تھا۔ گویا مجھ پر بجلی گر گئی تھی اور میں جل اٹھا تھا۔ مجھے خود خبر نہ تھی کہ میں کیا کہہ رہا ہوں۔ لاریلا! میں معافی بھی نہیں مانگتا۔ تم کشتی پر چلی آؤ۔ اپنی جان ہلاکت میں

مت ڈالو!

لاریلا پیرتی رہی، گویا اس نے سنا ہی نہیں۔

انتونیو نے پھر کہا "تم پیر کر ساحل تک نہیں پہنچ سکتیں! پورے دو میل ہے۔ اپنی ماں کا خیال کرو ــــ اگر تمہیں کچھ ہو گیا تو میں بھی جان دے دوں گا!"

لاریلا نے نگاہوں سے دوری کا اندازہ کیا۔ پھر اس کی باتوں کا جواب دیئے بغیر کشتی کے پاس آئی کنارہ پکڑا اور اوپر چڑھنے لگی۔ انتونیو سہارا دینے کے لئے بڑھا۔ کشتی بوجھ سے ایک طرف جھک پڑی۔ انتونیو کی جیکٹ کنارے پر رکھی تھی وہ دریا میں گر پڑی...

لاریلا سہارا لئے بغیر ہی اچک کر اپنی پہلی جگہ پر آ بیٹھی۔

انتونیو نے اسے مطمئن دیکھ کر پھر کشتی کھینی شروع کر دی۔ لاریلا اپنے بھیگے ہوئے کپڑوں اور بالوں کو نچوڑنے لگی۔

یکایک اس کی نظر کشتی کے پیندے پر پڑی۔ وہ خون سے رنگین تھی۔ معاً اس کی نگاہیں ہاتھ کی طرف گئیں ہاتھ اس طرح پتوار تھامے تھا جیسے زخمی نہ ہو!

"یہ لو" لاریلا نے اپنا رومال بڑھا کر کہا۔ انتونیو نے سر ہلایا اور کشتی چلاتا رہا۔

تھوڑی دیر بعد وہ اٹھی۔ ملاح کے پاس گئی اور خود زخم کو رومال سے کس کر باندھ دیا۔ زخم بہت گہرا تھا۔

اس کے شدید انکار کا کچھ خیال نہ کرتے ہوئے دوشیزہ نے زخمی ہاتھ سے پتوار لے لیا اور انتونیو کے سامنے بیٹھ کر کشتی چلانے لگی۔ ملاح کو وہ نہیں دیکھ رہی تھی لیکن خون آلودہ ڈانڈ پر اس کی نظریں جمی ہوئی تھیں۔

دونوں زرد تھے، خاموش۔

جب ساحل کے قریب پہنچے تو ماہی گیر صاحب سلامت کرنے لگے۔ بعضوں نے آپس میں کچھ اشارات بھی کئے۔ لیکن وہ دونوں بالکل چپ تھے۔ انھیں ذرا بھی جنبش نہ ہوئی۔

آفتاب ابھی چمک رہا تھا۔ لاریلا نے اپنے کپڑے درست کئے، جو اب تک سوکھ چکے تھے، اور ساحل پر کود پڑی۔

صبح والی بڑھیا جو انہیں جاتے دیکھ چکی تھی، اب بھی وہیں چھت پر کھڑی تھی۔

وہ چلائی "تیرے ہاتھ میں کیا ہوا؟ انتونیو! خدا خیر کرے! کشتی خون سے بھری ہے"!

نوجوان نے لاپروائی سے جواب دیا "کچھ نہیں" "کشتی میں ایک کیل نکلی ہوئی تھی۔ اسی سے زخم لگ گیا ہے! کل تک اچھا ہو جائے گا۔ یہی کمبخت میرا خون تو مصیبت ہے۔ اچھا ہوا نکل گیا"

"لاؤ میں پٹی باندھ دوں۔ ذرا ٹھہر میں ابھی جڑی بوٹی لاتی ہوں"

"تکلیف نہ کرو۔ پٹی بندھ چکی ہے۔ صبح تک بالکل ٹھیک ہو جائیگا"

"خدا حافظ!" لاریلا نے سڑک کی طرف جانے کے لئے مڑتے ہوئے کہا۔ وہ اب تک کھڑی بڑھیا کی باتیں سن رہی تھی!

"خدا حافظ" انتونیو نے اس کی طرف دیکھے بغیر جواب دیا، اور اپنی ٹوکری اور پتوار کشتی سے اتار کر اپنی جھونپڑی میں چلا گیا۔

انتونیو اپنے کمروں میں تنہا ٹہل رہا تھا۔ ٹھنڈی ہوا بے شیشہ کی کھڑکیوں سے آتی ہوئی کھلے سمندر کی ہواؤں سے زیادہ فرحت زا تھی "تنہائی اس کے لئے سکون بخش تھی۔ وہ کنواری کے مجسمے کے سامنے کھڑا ہو گیا لیکن اس نے دعا نہ کی۔ اب دعا کی کیا ضرورت تھی! اب جبکہ زندگی کی تمام آرزوئیں وہ کھو چکا تھا۔

اور یہ دن ختم ہوتا معلوم نہ ہوتا تھا۔ وہ رات کے لئے بے تاب تھا، کیونکہ وہ تھکا ہوا تھا۔ اسٹول پر بیٹھ کر اس نے ہاتھ کی پٹی (لاریلا کا رومال) کھولی۔ خون جو اب تک دبا ہوا تھا بہنے لگا۔ زخم کے چاروں طرف ہاتھ سوج گیا تھا اس نے ہاتھ دھویا۔ ٹھنڈے پانی سے اس کے درد میں کچھ افاقہ ہو گیا۔ لاریلا کے دانتوں کے نشان صاف نظر آ رہے تھے۔

وہ اپنے آپ سے کہنے لگا۔ "اس کی کچھ خطا نہیں میں وحشی ہو گیا تھا اور اس کی یہی سزا تھی۔ کل بڑھیا کے ہاتھ اس کا رومال واپس کر دوں گا۔ اور اب کبھی اس سے نہ ملوں گا"

دانتوں سے اور بائیں ہاتھ کی مدد سے جوں توں کر کے اس نے پٹی باندھی۔ بستر پر لیٹ رہا اور آنکھیں بند کر لیں............

.... چاند کی تیز شعاعوں اور ہاتھ کے درد نے اسے فوراً ہی پھر جگا دیا۔ ٹھنڈے پانی سے ہاتھ دھونے کے لئے اٹھا ہی تھا کہ دروازے پر دستک سنائی دی۔

لاریلا اس کے سامنے کھڑی تھی۔

وہ بغیر کچھ کہے اُسنے اندر چلی آئی، سر سے رومال کھولا اور اپنی ٹوکری میز پر رکھ کر اطمینان کی سانس لی۔

انتونیو نے پوچھا "رومال لینے آئی ہو؟ تکلیف اٹھانے کی کیا ضرورت تھی۔ میں خود کل صبح بھیج دیتا۔"

لاریلا نے ہانپتے ہوئے جواب دیا۔ "رومال کے لئے نہیں۔ دیر سے پہاڑی پر خون روکنے والی بوٹیاں تلاش کر رہی تھی۔ یہ دیکھو!" اس نے ٹوکری کا ڈھکنا اٹھا دیا۔

ملاح نے نرمی سے کہا "تم نے بڑی تکلیف کی۔ بہت تکلیف! میں تو اب اچھا ہوں۔ بہت اچھا!.. لیکن اگر مجھے تکلیف ہوتی بھی تو میں اسی لائق تھا! تم اس وقت کیوں آئیں؟ اگر کوئی دیکھ لے؟..... لوگوں کی حالت تم جانتی ہی ہو۔ انہیں اشارہ چاہئے، چاہے واقعہ کچھ بھی نہ ہو۔"

لاریلا نے تیز ہو کر کہا "میں کسی کی بکواس کی پروا نہیں کرتی! میں تمہارا ہاتھ دیکھنے اور دوا لگانے آئی ہوں۔ تم اپنے بائیں ہاتھ سے دوا نہیں لگا سکتے!"

"لیکن اس کی ضرورت نہیں۔ میں سچ کہتا ہوں۔"

"تو مجھے دیکھنے دو۔"

یہ کہہ کر اس نے ہاتھ پکڑ لیا اور پٹی کھول دی۔ ورم دیکھ کر اس نے جھرجھری سی لی اور چلائی "یا اللہ!"

انتونیو نے بے پروائی سے کہا "معمولی سا ورم ہے کل تک کم ہو جائے گا!"

لاریلا نے سر ہلایا

"تم ایک ہفتے سے پہلے کام پر نہیں جا سکتے۔"

"زیادہ سے زیادہ ایک یا دو دن۔"

لاریلا ایک پیالہ لیتی آئی تھی۔ اس نے زخم کو بڑی توجہ سے دھویا۔ انتونیو ایک بچے کی طرح کراہتا تھا۔ لاریلا نے دوا تھوپ دی اور پٹی باندھ دی۔ دوا رکھتے ہی درد میں کمی ہو گئی۔

جب پٹی بندھ چکی تو انتونیو نے کہا:۔

"لاریلا! شکریہ!— اگر مجھ پر ایک اور احسان کرنا چاہو تو میری دن والی دیوانگی معاف کر دو۔ میری سب باتیں بھول جاؤ۔ میں نہیں کہہ سکتا یہ سب کیونکر ہوا! اس میں تمہارا کچھ قصور نہیں، ذرا بھی نہیں۔ اب میری زبان سے کبھی کوئی ناگوار بات نہ سنو گی۔"

لاریلا قطع کلام کرتے ہوئے جلدی سے بولی "معافی مجھے مانگنی چاہئے۔ مجھے ایسا برتاؤ نہ کرنا چاہئے تھا۔ کاش میں تمہیں نرمی سے سمجھا دیتی۔ تمہیں غصہ دلا کر میں نے سخت غلطی کی۔ اور یہ زخم......"

"تم نے صرف اپنے بچاؤ کے لئے ایسا کیا۔ تمہیں ایسا ہی کرنا چاہئے تھا۔ میری دیوانگی حد سے بڑھ چکی تھی۔ میں پھر کہتا ہوں یہ کچھ بھی نہیں! معافی کا ذکر ہی نہ کرو۔ تم نے تو مجھ سے بھلائی کی! اور مجھے تمہارا ممنون ہونا چاہئے اور یہ لو اپنا رومال لیتی جاؤ"!

انتونیو نے رومال بڑھا دیا لیکن وہ چپ چاپ کھڑی رہی، ہچکچاتی ہوئی۔ اس کے سینے میں سخت ہیجان تھا۔ آخر کار اس نے کہا "میری غلطی سے تمہاری جیکٹ بھی چلی گئی۔ نارنگیوں کی تمام قیمت اس کے جیب میں تھی۔ مجھے بہت دیر بعد اس کا خیال آیا۔ میں اس کی تلافی نہیں کر سکتی ——— ہمارے پاس اتنا پیسہ کہاں! اور اگر ہے بھی تو ماں کا ——— لیکن یہ چاندی کی صلیب، میری بے مصور نے جاتے وقت اسے میز پر چھوڑ دیا تھا۔ میں نے آج تک اس پر نظر بھی نہ کی تھی نہ اسے بکس ہی میں رکھا۔ اگر تم اسے بیچ لو تو شاید تمہارے پیسے وصول ہو جائیں ——— اور پورے وصول نہ ہوں تو باقی میں ماں کے سو جانے کے بعد روزانہ سوت کات کر ادا کر دوں گی۔"

انتونیو نے اس کے ہاتھ کو، جس میں چمکیلی صلیب تھی اپنے سامنے سے ہٹاتے ہوئے کہا "میں ہرگز نہیں لے سکتا!"

لاریلا نے کہا "لو! کیا جانے کب تک تمہارا ہاتھ کام کرنے کے قابل نہ ہو سکے؟ یہ صلیب رکھی ہے۔ میں اب اسے دیکھ بھی نہیں سکتی"!

"تو سمندر میں ڈال دو!"

میں تمہیں تحفۃً نہیں دے رہی ہوں۔ تمہارا مجھ پر قرض ہے میں تو اپنا بوجھ ہلکا کر رہی ہوں۔"

انتونیو نے جوش سے کہا "تم پر میرا کوئی قرض نہیں! ہاں اگر تم مہربانی کرنا چاہو تو جب کبھی میں اب ملوں تو میری طرف نہ دیکھو۔ اگر تم دیکھو گی تو مجھے خیال ہو گا کہ تم میری اُس حرکت کو یاد کر رہی ہو ——— اچھا خدا حافظ! یہ ہماری آخری گفتگو ہے۔"

لاریلا نے رومال ٹوکری میں ڈال دیا۔ صلیب بھی اس میں

گرادی اور ڈھکنا بند کر دیا۔ لیکن انتونیو نے اس کے چہرے کو دیکھا تو چونک پڑا۔ آنسوؤں کے بڑے بڑے قطرے اس کے رخساروں پر بہہ رہے تھے۔

انتونیو نے گھبرا کر کہا۔ "خدایا! تمہاری طبیعت کیسی ہے؟ تم سر سے پیر تک کانپ رہی ہو۔"

"میں بالکل اچھی ہوں مگر اب مجھے گھر جانا چاہیئے۔"

لڑکھڑاتے ہوئے قدموں سے وہ دروازے کی طرف بڑھی...

... اور دیوار سے سر ٹیک کر رونے لگی... قبل اس کے کہ انتونیو آگے بڑھے وہ پلٹی اور اس نے اس کی گردن میں باہیں ڈال دیں۔

"میں اب اس زندگی کو برداشت نہیں کر سکتی!" اس نے ملاح کو زور سے پکڑتے ہوئے کہا جیسے کوئی دنیا کو چھوڑنے والی روح اپنے جسم سے چمٹی جا رہی ہو... "میں برداشت نہیں کر سکتی! تم مجھے اتنی نرمی سے! اپنی محبت سے جانے کے لئے کہہ رہے ہو! آہ میں تمہیں اس طرح بولتے نہیں سن سکتی!... مجھے مارو! کچل دو! ملامت کرو! یا اگر میری ان سب حرکتوں کے باوجود بھی مجھ سے محبت کرتے ہو تو مجھے اپنے پاس ---- مجھے اس طرح اپنے پاس سے نہ جانے دو..." سسکیوں کی وجہ سے وہ آگے کچھ کہہ نہ سکی.... اس کی زبان بند تھی۔ انتونیو اس کے نازک جسم کو اپنی آغوش میں لئے ہوئے تھا۔

"اگر میں تم سے اب بھی محبت کرتا ہوں!" اس نے آخر کار کہا۔ "کیا تم سمجھتی ہو کہ میرا دل خون ہو کر زخم کی راہ بہہ گیا! کیا تم اسے دھڑکتے ہوئے سن نہیں رہی ہو ---- جیسے کہ یہ پسلیاں توڑ کر نکل جائے گا۔

---- لیکن اگر تم میرا امتحان لینا چاہتی ہو یا تسلی دینے کے لئے کہتی ہو تو میں یہ سب باتیں بھلا بھی سکتا ہوں! تم یہ خیال نہ کرو کہ چونکہ میں نے تمہاری وجہ سے دکھ اٹھایا ہے اس لئے تم پر میرا اب حق ہے۔"

"نہیں" لاریلا نے اس کے کاندھے پر سے سر اٹھا کر اپنی پُرنم آنکھیں اس کے چہرہ پر جما کر فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

"میں یہ اس لئے کہہ رہی ہوں کہ مجھے تم سے محبت ہے۔ مجھے اب کہنے دو! چونکہ میں تم سے محبت کرنے سے ڈرتی تھی اس لئے چڑچڑا کر باتیں کیا کرتی تھی۔ لیکن اب نہیں ---- اور تاکہ تمہیں اب کوئی شک نہ رہے میں تمہیں اپنے ہونٹ چومنے دوں گی۔ یاد رکھو لاریلا کے ہونٹ اس کے شوہر کے سوا اور کوئی نہیں چوم سکتا۔"

پھر اس کے ہاتھوں سے اپنے کو چھڑا کر کہا۔

"خدا حافظ! اب سو رہو اور اپنا ہاتھ اچھا ہو جانے دو ---- نہیں میرے ساتھ نہ آؤ۔ میں کسی سے بھی نہیں ڈرتی ---- تمہارے سوا!"

---- وہ آہستہ سے باہر نکل کر تاریکی میں غائب ہو گئی!

وہ کھڑکی کے پاس کھڑا ساکن سمندر کی طرف دیکھ رہا تھا۔ نیلے آسمان پر روشن ستارے اسے رقص کرتے ہوئے معلوم ہو رہے تھے۔

اعتراف کی کرسی پر بیٹھا پادری خود بخود مسکرا رہا تھا۔ لاریلا نے ابھی ابھی بہت لمبا اعتراف ختم کیا تھا!

پادری اپنے آپ سے کہہ رہا تھا۔ "کون کہہ سکتا تھا کہ خدا اس چھوٹے سے گمراہ دل کو اس قدر جلد ہدایت دے گا؟ ہماری آنکھیں کوتاہ بین ہیں، آسمان کے راز نہیں دیکھ سکتیں۔ خدا اس پر اپنا فضل کرے اور میں اتنے دن اور زندہ رہوں کہ اپنے باپ کے بجائے لاریلا کا اکلوتا بیٹا مجھے اپنی کشتی پر رکھے کرنے جائے!

---- "باعصمت دوشیزہ!"

تمنائی

خود فراموشی

اونچے سُروں میں ایک غزل گا رہا ہوں میں
گو درد کی کسک سے مرا دل ہے بے قرار

یونہی ڈبو کے درد کو گیتوں کے شور میں
ناخوشگوار کو میں بناتا ہوں خوشگوار

اختر انصاری

غزل

دلبرِ صد عشوہ زا مطلوب ہے — خوبصورت تر بلا مطلوب ہے

اہلِ دل ہوں، دلربا مطلوب ہے — بندہ بننا ہے خدا مطلوب ہے

بے وفا! کیا کہیئے، کیا مطلوب ہے — طاقتِ ترکِ وفا مطلوب ہے

اذن ہو تو عرضِ حالِ دل کروں — طبعِ نازک کی رضا مطلوب ہے

اے وفا کے خبط والے کچھ اَور سُن — اب اُنہیں شکرِ جفا مطلوب ہے

او ستمگر! کچھ خطا ہو یا نہ ہو — اب بہر حالت سزا مطلوب ہے

پھر گرفتارِ غمِ حاجات ہوں — پھر کوئی حاجت روا مطلوب ہے

مضطر آیا ہوں، سکوں درکار ہے — درد لایا ہوں دوا مطلوب ہے

کچھ بھی ہو، اب میں ہوں اور تیری تلاش — کچھ بھی ہو، تیرا پتا مطلوب ہے

واہ اُس طالب کی قسمت، جو مدام — شاغلِ تسبیحِ "یا مطلوب" ہے

اے ترے قربان! اب اتنی سُدھ کہاں — تو مرا طالب ہے یا مطلوب ہے

شورِ فریادِ گدا ناحق نہیں — التفاتِ بادشا مطلوب ہے

شیخ! آپ اور حُبِّ زر سے یہ جہاد — ہو نہ ہو، کچھ فائدہ مطلوب ہے

رند ہیں اور بادہ و شاہد کا قحط — حضرتِ زاہد! دعا مطلوب ہے

پائے لنگِ فقر لے کر کیا کروں — بازوئے کشور کشا مطلوب ہے

قطعہ

حضرتِ آزاد! جلد اٹھیئے، اگر — منصبِ عزت فزا مطلوب ہے

یوں سنا ہے، بندگانِ شاہ کو
اک غلامِ باوفا مطلوب ہے

حکیم آزاد انصاری

نیا پجاری

کوئی ہے بہارِ چمن کا پجاری | کوئی ہے گلِ یاسمن کا پجاری
بتِ مولوی کو کوئی پوجتا ہے | کوئی قشقۂ برہمن کا پجاری
غلامِ غلامانِ زمزم ہے کوئی | کوئی موجِ گنگ و جمن کا پجاری

مگر میرا ذوقِ پرستش جدا ہے
میں ساغر ہوں اپنے وطن کا پجاری

وطن وہ وطن وہ مہکتا شوالا | وہ راحت کا مندر محبت کا کعبہ
خطیبِ ہمالہ کا زرکار منبر | وہ جمنا کی گودی وہ گنگا کا جھولا
وہ مندر ہے میرا وطن جس کے اندر | ہزاروں خدا ہیں تو لاکھوں کلیسا

مگر میرا ذوقِ پرستش جدا ہے
میں ساغر ہوں اپنے وطن کا پجاری

کوئی ہے پرستارِ گیسوئے ہندو | کوئی ہے بتِ سیم تن کا پجاری
کوئی سرخ ٹیکے پہ دُھن رہا ہے | کوئی شعلۂ انجمن کا پجاری
کوئی ہے مریدِ کنیزانِ کعبہ | کوئی دخترِ برہمن کا پجاری

مگر میرا ذوقِ پرستش جدا ہے
میں ساغر ہوں اپنے وطن کا پجاری

وہاں ہے کوئی، کوئی سومناتی | معابد کسی نے بنائے ہیں ذاتی
ہر اک سے محبت ہر اک سے اخوت | میں ہندی ہوں مذہب مرا کائناتی
محبت سے اونچا نہیں کوئی مذہب | محبت سے اونچی نہیں کوئی جاتی

مگر میرا ذوقِ پرستش جدا ہے
میں ساغر ہوں اپنے وطن کا پجاری

رشی کیش میں کوئی بیٹھا ہوا ہے | کوئی ہر کی پیڑی کے گن گا رہا ہے
بنارس کی گلیوں میں پھرتا ہے کوئی | مزاروں پہ جا کر کوئی ناچتا ہے
کلیسا میں ہے محوِ تثلیث کوئی | کوئی دیر میں مورتی پوجتا ہے

مگر میرا ذوقِ پرستش جدا ہے
میں ساغر ہوں اپنے وطن کا پجاری

ہر اک قیدِ فرضی سے آزاد ہوں میں | ترقی دہِ بزمِ ایجاد ہوں میں
عقیدے مرے سامنے کانپتے ہیں | اصولِ محبت کی بنیاد ہوں میں
نہ زنار کا غم نہ تسبیح کا غم | دماغی غلامی سے آزاد ہوں میں

مگر میرا ذوقِ پرستش جدا ہے
میں ساغر ہوں اپنے وطن کا پجاری

ساغر نظامی

ہندی ڈرامے کی وسعت

اول اول آرین دنیا کی مختلف زبانوں میں شاعری نہایت محدود اصناف میں ہوا کرتی تھی۔ جذبات کے اظہار کے بہت تھوڑے طریقے تھے۔ جیسے غم والم کو مرثیہ، کتبہ یا اپنے معمولی تصور کو نہایت سادی نثر میں ظاہر کرتے تھے۔ خوشی کے مواقع پر مسرت کے ترانے گائے جاتے یا فخر و مباہات کی نظمیں پڑھی جاتیں لیکن جوں جوں زمانہ گزرتا گیا اور انسانی ماحول زندگی کے نئے نئے شعبہ جات اور جدید تکلفات سے آشنا ہونے لگا تو اس کے مطابق شاعری نے بھی اپنے قالب بدلنے شروع کئے۔ چنانچہ مخترعین کی فہرست میں اہل یونان کو ہر صورت سے اولیت حاصل ہے۔ انہوں نے نہ صرف طریق حکومت، فلسفہ حکمت، ریاضی اور منطق کو دنیا کے سامنے پیش کیا بلکہ طریق زندگی کے جتنے کارآمد اور مفید طریقے تھے ان کو سب سے پہلے اہل عالم سے روشناس کرایا اور سب کو عملاً ثابت کر دکھایا فنون لطیفہ کی جدت طرازی اور ترقی میں انھوں نے جو پیش قدمی کی وہ آج بھی ان کے لئے قابل فخر ہے۔ چنانچہ شاعری کی صنف میں سب سے پہلے ڈرامے کو انہوں نے رواج دیا جس کے کچھ ہی عرصہ بعد اہل ہند نے ان کی تقلید کی اور اپنی نازک خیالی سے دنیا کے ہر ملک کو نیچا دکھا دیا۔

مورخین کے خیال کے مطابق ہماری "ڈرامائی تاریخ" میں یہ بات نہایت تحیر خیز ہے کہ سکندر کی فتح کے بعد اہل یونان اور اہل ہند کے میل جول نے خوب خوب گل کھلائے۔ اس دوستی کے اثرات فریقین پر نہایت خوشگوار پڑے۔ دونوں قوموں نے ہر ایک کے فنون لطیفہ اور دیگر علوم و فنون کے اثرات کو کافی حد تک قبول کیا چنانچہ ہندی شاعری (خواہ وہ سنسکرت ہو یا دوسری کوئی پراکرت یہاں صرف اہل ہند کی زبان مراد ہے) میں اسی زمانے سے 'ڈرامے' نے نشو و نما پائی۔ موریہ اور گپت کے عہد زریں میں جہاں ہندی راجاؤں کے تعلقات باختر، سندھ، اور مکران وغیرہ کے یونانی سرداروں سیلوکس وغیرہ سے بڑھے وہیں علوم و فنون کی انتہائی ترقی نے فن ڈراما کی صنف میں جو انمول موتی پیدا کئے ان کی نازک خیالی اور بلند پائگی پر دنیا آج بھی عش عش کرتی ہے۔

الفضل للمتقدم کے لحاظ سے یونانی ڈراموں کو سب پر فضیلت حاصل ہے۔ لیکن جب ان کی تقسیم اور نوعیت پر نظر کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ عرصہ دراز تک ان میں یہ فن بالکل معمولی حالت میں رہا۔ سادے خیالات اور سادی تقسیم پر عمل ہوتا رہا اور اس میں ذہنی قسمیں اور پیچیدگیاں پیدا نہیں ہو سکیں۔

چنانچہ ارسطو کی تقسیم سے معلوم ہوتا ہے کہ معدودے چند ہی اصول تھے جنہیں پیش نظر رکھ کر کسی ڈرامے کو ترتیب دیا جاتا تھا۔ ان کے اصول کو اس طرح سے ظاہر کر سکتے ہیں:۔

۱۔ اتحاد ثلاثہ:۔
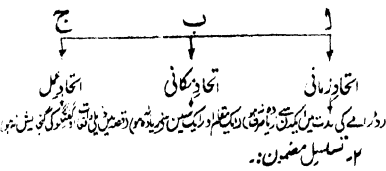
ا	ب	ج
اتحاد زمانی	اتحاد مکانی	اتحاد عمل

(ڈرامے کی مدت میں ایک دن سے زیادہ صرف نہ ہو) (ایک مقام اور ایک سین منظر پیدا ہو) (قصہ میں فالتو باتوں اور گفتگو کی گنجائش نہ ہو)

۲۔ تسلسل مضمون:۔

ا:۔ اظہار غم میں ظرافت اور ہنسی کا شائبہ تک نہ ہو

ب:۔ ظرافت اور خوش طبعی میں غم کی کچھ بھی جھلک نہ ہو۔

۳۔ ڈرامے کو بجائے عملی طور پر دکھانے کے وقتاً فوقتاً قصے کے واقعات کو پبلک کے سامنے پڑھ دیا جاتا تھا اور تصور کر لیا جاتا تھا کہ پردے کے پیچھے جذبات کو عملاً ظاہر کیا جا رہا ہے۔

یونانیوں کے یہ عام فہم اصول ہندی ذہن رسا کے آگے بازی گہ طفلاں سے بڑھ کر نہ تھے۔ چنانچہ بالکل ہی قلیل مدت میں مرغ تصور کی رسائی کو انہوں نے بالائے بام سے بالائے عرش کر دیا۔

اہل ہند کے عقیدے کے مطابق اس صنف کا موجد بھرت تھا اور بعض لوگ اس کو خالق اکبر "برہما" ہی کی ذات سے منسوب کرتے ہیں۔ خیال یہ تھا کہ مختلف دیوتاؤں، عابدوں اور پریوں کے قصوں کو

علیحدہ علیحدہ ڈراموں کی صورت میں ترتیب دیا گیا تھا جنھیں گندھرب اور اپسرایں نامی دو پریاں آسمانی دیوتاؤں اور خداؤں کے آگے پیش کرتی تھیں۔ یوں تو ہر فن یعنی موسیقی، شاعری، افسانہ نگاری وغیرہ کی علیحدہ علیحدہ دیویاں یا خدا تھے لیکن اس کی نمایش کا کام انہیں پریوں کے سپرد کر دیا گیا تھا۔ فن ڈراما کے ان سارے اصناف کے مجموعے کو "روپک" کے اسم کل سے زینت دی گئی۔

پہلی تقسیم میں روپک کی تین جداگانہ صورتیں ہوئیں پہلی "ناٹئے" اصلی ناٹک، جس میں عمل کے ساتھ بول چال وغیرہ بھی ہے۔ دوسری "نرتئے" اور تیسری "ونرت" ان دونوں میں بغیر بول چال کے صرف عمل یا عموماً ناچ کے ذریعے کام لیا جاتا تھا۔ اس کے بعد روپک کی دس قسمیں قرار پائیں ان دس اقسام کی یوں تو لاتعداد صورتیں پیدا ہو جاتی ہیں اور تقریباً ہر جذبے اور ہر خیال کے لئے علیحدہ وضع اور علیحدہ قسم کا ڈراما بن جاتا ہے لیکن یہاں انہیں نظر انداز کر کے صرف پہلی دس قسموں ہی کو لکھا جاتا ہے اور وہ حسب ذیل ہیں:

۱ ناٹک:۔ ڈرامے کا اصلی، مکمل اور اعلیٰ نمونہ تھا اس کا موضوع یا تو تاریخی، فرضی، دیومالی اور افسانوی ہوتا تھا یا عشق و محبت کا سیدھا سادھا قصہ ہوتا تھا قصے کی مدت کم سے کم چند دن اور زیادہ سے زیادہ ایک سال ہوا کرتی تھی۔ اس میں ۵ ایکٹ سے لے کر دس ایکٹ تک ہوا کرتے تھے اس کی مثال حسب ذیل ڈرامے ہو سکتے ہیں شکنتلا، مدرا راکھس، وینی سنگھار وغیرہ۔

۲ پرکرن:۔ اس کے مضامین اعلیٰ نہیں ہوتے تھے۔

۳ بھانہ:۔ اس میں ایکٹ ہوتا تھا اور واقعات بالکل معمولی ہوتے تھے

۴ ویایوگ:۔ جس میں صرف جنگی معرکوں کی نمایش ہوتی۔ اس میں عورتوں کو داخل ہونے کی اجازت نہ تھی۔

۵ سمو کار:۔ تین ایکٹ میں کسی دیوتا کے قصے کو پیش کیا جاتا۔

۶ ڈیم:۔ اس کا مضمون ڈراونا اور عبرت انگیز ہوتا تھا مثلاً ہریشچندر

۷ اہامرگ:۔ اس میں بھی ایک ایکٹ یا زیادہ بھی ہوتے تھے۔ مضمون دردانگیز ہوتا تھا۔

۸ ...تھی:۔ اس میں دو ایکٹ ہوتے تھے جن کی گفتگو ظرافت اور ... سے مالامال ہوتی تھی۔

۹ × × × × × × × × × ×

۱۰ پرہسن:۔ جس میں عموماً کسی کی ہجو یا تمسخر اڑایا جاتا

اس سے ظاہر ہے کہ نوعیت مضامین، پلاٹ، قصہ اور ہر طرز کے مذاق کا ان کے ہاں کتنا خیال رکھا جاتا تھا۔ چنانچہ حزنیہ اور طربیہ (ٹریجیڈی اور کمیڈی) کے جذبات میں ذرا سی بھی خلط ملط ہو جائے یا تسلسل قصہ میں کسی قسم کا نیا عنصر شامل ہو جائے یا موضوع میں کسی قسم کی معمولی تبدیلی ہو جائے تو اس کے لئے ان کے ہاں ایک جدید قسم اور ایک جدید نام کا فوراً بندوبست ہو جاتا۔ اسی لئے بالکل تھوڑے عرصے میں اہل ہند کا ڈراما حقیقی معنوں میں مکمل ڈراما کہلانے کا مستحق ہو گیا۔

اس کے بعد مضامین ڈراما کی تین حصوں میں تقسیم کی گئی اول مادہ یا پلاٹ جس کو "وستو" کہا جاتا ہے۔ دوسرے "بیتا" یعنی ہیرو تیسرے "رس" یعنی جذبہ۔ وستو کی پھر دو قسمیں ہو گئیں۔

(۱) ادھی کارک (اصلی) (۲) پرسنگک (فروعی) اور سارے ڈراموں کے نتیجے کو "کارئے" کہا جاتا ہے۔

وستو کے بعد ہیرو کی باری ہے چنانچہ عادات و اطوار اور ذاتی اوصاف کی بنا پر اس کی پہلے چار قسمیں کی گئیں۔

۱ "للت":۔ خوش طبع، بے پروا، خلیق۔

۲ "شانت": حلیم اور نیک مزاج۔

۳ "دھیرو دات": باہمت، مستقل مزاج اور عزم راسخ کا مالک

۴ "یودرت":۔ پرجوش، حوصلہ مند اور طاقت ور

ان چار اقسام میں سے ہر ایک کی بارہ بارہ قسمیں ہیں اس طرح صرف ہیرو کی اڑتالیس قسمیں ہوئیں یاد رہے کہ یہ صرف انسانی صفات کا ذکر ہے۔ دیوتا اس سے علیحدہ ہیں چنانچہ ہیرو کی ذات میں دیوتا اور انسان دونوں بھی شامل کر لئے جائیں تو ان کے اقسام (۱۴۴) ایک سو چوالیس ہوتے ہیں اور ہر ہیرو کو خواہ وہ کسی قسم سے ہو حسب ذیل آٹھ صفات سے متصف ہونا ضروری ہے:۔

"حسن، عیش پرستی، خوش طبعی، سلامت روی، شجاعت، روشن دماغی، فصاحت اور فیاضی"۔

ہیروئن:۔ ہیرو کی طرح ہیروئن کی بھی بیشمار اقسام کی گئیں۔ ہیروئن کا نام "نایکہ" ہے۔ اس کی پہلی تقسیم حسب ذیل ہے:۔

(۱) "مگدھا" نوخیز (۲) "پراودھا" شباب میں ڈوبی ہوئی (۳) "پرگلبھا"

بحثیت کار دوسری تقسیم میں اس کی آٹھ قسمیں قرار پائیں:۔

(۱) "سُوادھن پتیکا" جو اپنے شوہر کی وفادار ہو۔
(۲) "وَسکا سجّا" جو عاشق کے انتظار میں زیور و لباس سے آراستہ بیٹھی رہے۔
(۳) "وِرہت کنتھیا" جو اپنے عاشق کے فراق میں محزون و ملول ہو
(۴) "کھنڈتیا" جس کو عاشق کی بے وفائی کا حال معلوم ہونے سے سخت روحانی صدمہ ہو۔
(۵) "کلہان ترتیا" جو حقیقی یا فرضی تغافل کے خیال سے اپنی حالت غصے میں بھری ہوئی بنالے یا اپنے چہرے وغیرہ سے ملال ظاہر کرے۔
(۶) "پرلبدھا" جس پر مطلوب کے وعدہ فراموش کرنے سے بالکل مایوسی چھا جائے۔
(۷) "پروشِت بھرتریکا" وہ ہے جس کا عاشق یا شوہر پردیس میں ہو۔
(۸) "ابھی ساریکا" وہ عورت ہے جو پیش قدمی کرکے خود عاشق سے ملنے جائے۔

"رس" یا جذبہ:۔ پلاٹ اور ہیرو اور ہیروئن کے بعد اس کی تقسیم شروع ہوتی ہے اور حقیقت میں دیکھا جائے تو جذبہ ہی ہے جس کے الٹ پھیر سے ڈراما کہیں سے کہیں جا پہنچتا ہے۔ انسانی جذبات کی کوئی انتہا نہیں۔ مسرت، غم، غصہ، نفرت اور حیرت وغیرہ کے علاوہ معمولی سے معمولی واقعات پر بھی انسانی تخیل کا سمندر ہمیشہ موجزن رہتا ہے، اور اس کے ساتھ ساتھ اس کے جذبات میں بھی آناً فاناً تبدیلی ہوتی رہتی ہے۔ قدرت کے عجائبات دیکھنے سے فطرت کے بیش بہا مناظر پر نظر دوڑانے سے وحشت ناک چیزیں دیکھنے سے، قابل رحم انسانوں اور لائق مہربانی اشیا پر نظر ڈالنے سے اور اسی طرح آنکھ کی ایک معمولی حرکت سے اس کے دماغ پر ایک ٹھیس لگتی ہے جس کا لازمی نتیجہ دل میں ایک نئی امنگ اور نئی خواہش اور جذبے کی ایک ہلکی سی تحریک ہوتی ہے۔

جذبات کے اقسام در اقسام سے ہٹ کر ہم یہاں صرف "بھرت" کی تقسیم کو پیش کرتے ہیں جس کو اس نے ہر انسان کے لئے ضروری قرار دیا تھا۔

(۱) "شرنگار" عشق و محبت کا پاک جذبہ
(۲) "ہاسیہ" خوش طبعی کا جذبہ
(۳) "کرونا" جذبۂ درد و غم۔
(۴) "راودر" غصہ اور جوش کا جذبہ
(۵) "ویر" جذبہ ہمت و اولوالعزمی
(۶) "بھیانک" خوف و دہشت کا جذبہ
(۷) "بیبھتس" نفرت اور حقارت کا جذبہ
(۸) "ادبھوت" جذبۂ حیرت و تعجب
(۹) "شانت" جذبۂ حلم، صبر و رضا۔

اس کے بعد ترتیب مضامین ڈراما اور منظر عام پر لانے کے طریقے کو بیان کرکے مضمون کو ختم کرتا ہوں۔ ترتیب مضامین ڈراما میں سب سے پہلے وہ دعا ہوتی ہے جو حاضرین، ایکٹرس اور عوام کے لئے ہوتی ہے جس کو "ناندی" کہا جاتا ہے۔ اسی کے ساتھ ساتھ یا علیحدہ نظم یا نثر میں ایک خاص آدمی اپنی مجبوریاں، اہل زمانہ کی ناقدری یا عوام کی خوش آمدید یا ڈرامے کی تیاریوں اور قصے وغیرہ کے متعلق اپنے خیالات ظاہر کرتا ہے اور آخر میں ڈرامے کی کامیابی کے لئے دعا کرتا ہے جس میں بعض وقت سارے ایکٹر شریک ہوتے ہیں۔

ڈرامے کی تقسیم ایکٹوں کے ذریعے ہوتی ہے جن کو "انک" کہا جاتا ہے۔ پہلے ایکٹ کا نام "انک مکھ" ہے۔ جس طرح کھیل دعا سے شروع ہوتا ہے اسی طرح دعا پر ہی ختم ہوتا ہے جس کو "بھرت کارنے" کہتے ہیں۔ اس کے بعد کچھ اور کہنا ہو تو وہی آدمی اپنی غلطیوں کی معافی چاہتا ہے یا پبلک کی ہمت افزائی کا شکریہ ادا کرتا ہے۔

شیکسپیئر کے زمانے میں انگریزی ڈرامے کی کیا حالت تھی اور اس زمانے کے ڈرامے کو منظر عام پر لانے کے طریقے کو ہزاروں سال پہلے ہندوستان کے طریقوں سے مقابلہ کیا جائے تو زمین آسمان کا فرق ظاہر ہوگا۔ شیکسپیئر جیسے جذبات نگاری کے بادشاہ کے شاہکاروں کو بالکل معمولی طریقوں سے دکھلایا جاتا تھا عموماً دن کے تین بجے سے کھیل شروع ہوکر چھ بجے مغرب تک ختم ہو جاتا تھا۔ کھلی چار دیواری میں تماشائیوں کو بھیڑوں کے گلوں کی طرح گھسایا جاتا تھا۔ جہاں وہ کھڑے کھڑے تماشہ ختم کردیتے تھے۔ صرف

بادشاہ یا معززارکانِ سلطنت کو اسٹیج کے پہلے آدھے حصے پر جگہ دی جاتی تھی۔ اسٹیج کے پیچھے ایک پردہ ہوتا تھا جہاں اداکار تیار ہو کر آتے تھے۔ نسائی کردار کو بجائے عورتوں کے خوبصورت نوجوان لڑکے انجام دیتے تھے۔ دوسرے شہروں، دور دراز کے جنگلوں اور رات کے مناظر کو عملی طور پر نہ دکھلایا جاتا تھا۔ بلکہ اس قسم کی تختیاں لگائی جاتیں:۔

یہ استھنر ہے	اردن کا وسیع جنگل	بھیانک و طوفانی رات	ڈنکن قتل کیا گیا

اسی طرح موت، قتل، گرفتاری، جنگ اور محفلِ رقص و سرود وغیرہ کو دکھانے کی بجائے کسی عمدہ مقرر سے کہلوا دیا جاتا کہ "جنگ ہو رہی ہے" "گرفتاری عمل میں لائی گئی" "محفلِ نشاط گرم ہے" وغیرہ۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ عمدہ سے عمدہ ڈرامے سے بھی وہ کس قدر کم محظوظ ہو سکتے تھے۔

اس کے بجائے اہلِ ہند نے ابتدا ہی سے اپنی ذہانت اور حسن کاری کا ثبوت دینا شروع کیا۔ ان کے پاس باقاعدہ اسٹیج بنے ہوئے تھے۔ تماشائیوں کے لئے بہترین اور آرام دہ نشستیں بنائی گئی تھیں۔ کھیل کا وقت ہمیشہ شب ہی میں ہوا کرتا۔ روشنی کا اعلیٰ انتظام ہوتا۔ اداکاروں کے لئے حسبِ موقع اور حسبِ قصہ بہترین لباس تجویز کئے جاتے۔ اداکار ماہرِ جذبات ہوتے جو ہر ایک اثر کو بخوبی ظاہر کر سکتے۔

بہر حال اہلِ ہند کی ڈرامائی تاریخ پر نظر ڈالنے سے معلوم ہو گا کہ آج سے ہزاروں برس پہلے بھی ان کا ڈراما مکمل، ان کے اداکار ماہر تھے اور آج سے بہت عرصہ پہلے ہی ہندوستان میں جذباتِ انسانی کے ماہر کالی داس اور تلسی داس جیسی عظیم ہستیاں "شکنتلا" "رتناولی" "مُدرا راکشس" "وکرم اروسی" "وینی سنبھار" اور "مُدرا راکشس" جیسے شاہکار دنیا کے سامنے پیش کر چکے تھے۔

سید ابوالفضل حیدرآبادی

نوٹ:۔ اس مضمون کو حسبِ ذیل کتب سے حاصل کیا گیا ہے۔
(۱) انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا
(۲) ڈراما از ہڈسن
(۳) ہندی ڈراما۔ نامعلوم
(۴) ناٹک۔ ایک کنڑی مصنف کے قلم سے

تلخابِ محبّت

مری خطاؤں سے رکھو نگاہ اپنی بلند
تمہیں طلسمِ سکون و قرار کی سوگند
جو اضطراب کے سجدے نہیں ہیں تم کو پسند
توقعات کی دنیا کو چھین لو مجھ سے

تڑپ تڑپ کے گذاریں فراق کی راتیں
سسک سسک کے بھلائی ہیں پیار کی باتیں
رُلا رہی ہیں مگر شام کی ملاقاتیں
تاثرات کی دنیا کو چھین لو مجھ سے

فریبِ خوردۂ الفت کا دل نہ بہلاؤ
وفا پرست کو رنگیں ریا نہ سکھلاؤ
مری نگاہِ تخیّل سے دُور ہو جاؤ
تصوّرات کی دنیا کو چھین لو مجھ سے

حدیثِ سوزِ دلِ داغدار ختم کرو
شکستِ عقل کا اب انتظار ختم کرو
مری وفاؤں کا بھی اعتبار ختم کرو
تعلقات کی دنیا کو چھین لو مجھ سے

شمیم جمیلی

اقبال

وطنیت پہین اسلامزم اور سیاسی تحریکات

ممکن ہے کہ اس موضوع پر پہلے بھی کئی مقالے سپردِ قلم کئے گئے ہوں لیکن یہ ایک ایسا مضمون ہے کہ اس کا اعادہ کرتے ہی رہنا چاہئے۔ وجہ ؟

"گاہے گاہے باز خواں ایں قصۂ پارینہ را
تازہ خواہی داشتن گر داغ ہائے سینہ را"

بقول شیخ سر عبدالقادر صاحب قبلہ اقبال کا اردو کلام بیسویں صدی کے آغاز سے کچھ عرصہ پہلے شروع ہوتا ہے اور سب سے پہلی نظم جو انہوں نے ایک ایسی مجلس میں پڑھی جس میں مشاہیر شامل ہونے لگے تھے "کوہِ ہمالیہ" تھی۔ اسی نظم سے "بانگِ درا" کا آغاز ہوتا ہے اس نظم میں بقول شیخ صاحب وطن پرستی کی چاشنی موجود ہے۔ وطن پرستی کی چاشنی نہ صرف اس نظم میں پائی جاتی ہے بلکہ اس دور کی اکثر نظموں میں وطنیت کا جذبہ بدرجۂ اتم موجود ہے۔ ترانہ ہندی۔ ہندوستانی بچوں کا قومی گیت۔ بچے کی دعا۔ صدائے درد۔ تصویرِ درد وغیرہ ایسی نظمیں ہیں کہ اگر جعفر اور صادق بھی پڑھ لیتے تو ملک سے غداری نہ کرتے۔ بے لوث خدمتِ وطن کی خواہش کا اظہار اس شعر سے ہوتا ہے

ہو مرے دم سے یونہی میرے وطن کی زینت ✦ جس طرح پھول سے ہوتی ہے چمن کی زینت

بچے کی دعا

ملک کے باہمی افتراق و انشقاق سے دل پر صدمہ ہوا تو فرمایا

یہ زمیں ہی قیامت کی نفاق انگیز ہے	وصل کیسا یاں تو اک قرب فراق آمیز ہے
بدلے یکرنگی کے یہ ناآشنائی ہے غضب	ایک ہی خرمن کے دانوں میں جدائی ہے غضب

صدائے درد

فرقہ آرائی اور تعصب سے نشو و نما پانے والے اثرات کا جو دل طبیعت پر طاری ہوتا ہے اس کا اظہار یوں کیا گیا ہے

رُلاتا ہے ترا نظارہ اے ہندوستاں مجھ کو	کہ عبرت خیز ہے تیرا فسانہ سب فسانوں میں
شجر ہے فرقہ آرائی تعصب ہے ثمر اس کا	یہ وہ پھل ہے کہ جنت سے نکلواتا ہے آدم کو

تصویرِ درد

عام قومی تیرہ بختیوں کا علاج محبت تجویز کیا ہے۔

محبت ہی سے پائی ہے شفا بیمار قوموں نے ✦ کیا ہے اپنے بختِ خفتہ کو بیدار قوموں نے

تصویرِ درد

وطن خواہ کچھ بھی ہو وطن ہے۔ فرماتے ہیں۔

بیابانِ محبت دشتِ غربت بھی وطن بھی ہے ✦ یہ ویرانہ قفس بھی آشیانہ بھی چمن بھی ہے

تصویرِ درد

غلامی کا احساس کرتے ہیں تو یہ شعر زبان پر جاری ہو جاتا ہے۔

قیدی ہوں اور قفس کو چمن جانتا ہوں میں
غربت کے غم کدہ کو وطن جانتا ہوں میں

(شمع)

یہ شعر کس قدر دردِ قومی کا مظہر ہے۔

تجھے کیا دیدۂ گریاں وطن کی نوحہ خوانی میں
عبادت چشمِ شاعر کی ہے ہر دم باوضو رہنا

تصویرِ درد

مندرجۂ ذیل اشعار کیا ہیں محبت بھرے دل سے محبت کے سوتے بہہ نکلے ہیں لیکن تعصب کے کانٹے کا جو مختلف جماعتوں کے دامن میں الجھا ہوا ہے احساس بھی ہے۔

سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا ✦ ہم بلبلیں ہیں اس کی یہ گلستاں ہمارا

✶ ✶ ✶ ✶ ✶

غربت میں ہوں اگر ہم رہتا ہے دل وطن میں ✦ سمجھو وہیں ہمیں بھی دل ہو جہاں ہمارا

مذہب نہیں سکھاتا آپس میں بیر رکھنا   ہندی ہیں ہم وطن ہے ہندوستاں ہمارا

(ترانۂ ہندی)

وطن کی برتری کس اخلاص اور جذبے سے بیان کی گئی ہے اور کس قدر فخریہ لہجہ میں کون اس کو پڑھ کر مادرِ وطن پر فخر نہیں کرنے لگتا

یونانیوں کو جس نے حیران کر دیا تھا | سارے جہاں کو جس نے علم و ہنر دیا تھا
مٹی کو جس کی حق نے زر کا اثر دیا تھا | ترکوں کا جس نے دامن ہیروں سے بھر دیا تھا

میرا وطن وہی ہے میرا وطن وہی ہے

بندے کلیم جس کے پربت جہاں کے سینا | نوحِ نبی کا آکر ٹھیرا جہاں سفینہ
رفعت ہے جس زمیں کی بامِ فلک کا زینہ | جنت کی زندگی ہے جس کی فضا میں جینا

میرا وطن وہی ہے میرا وطن وہی ہے

ہندوستانی بچوں کا اسلامی گیت

برہمن اور واعظ ہر دو سے اُن کے وجہ نفاق بننے کی شکایت کی ہے اور پھر دونوں سے نفور ہو کر خاکِ وطن کے ہر ذرہ کو دیوتا قرار دیا ہے

اپنوں سے بیر رکھنا تو نے بتوں سے سیکھا | جنگ و جدل سکھایا واعظ کو بھی خدا نے
تنگ آکے میں نے آخر دیر و حرم کو چھوڑا | واعظ کا وعظ چھوڑا چھوڑے ترے فسانے
پتھر کی مورتوں میں سمجھا ہے تو خدا ہے | خاکِ وطن کا مجھ کو ہر ذرہ دیوتا ہے

نیا شوالہ

ان تمام اشعار میں جو ۱۹۰۵ء سے پہلے لکھے گئے اقبال کے سیاسی خیالات کا مرکز وطن ہے اور وہ وطنیت کے نہ صرف خود قائل ہیں بلکہ اوروں کو بھی اس کی تعلیم دیتے ہیں لیکن بعد میں ہندوستانیوں کی تاریک ذہنیت۔ تباہ کن فرقہ وارانہ تعصبات۔ فسادات اور اتحادِ قومی و احساسِ یگانگت کے فقدان کی وجہ سے ان سے مایوس ہو جاتے ہیں اور اس مایوسی کی صراحت ان کے اپنے ایک شعر سے ہوتی ہے۔

بخاکِ ہند نوائے حیات بے اثر است + کہ مردہ زندہ نگردد ز نغمۂ داؤد

بالکل سچ ہے ہم اسی لایق تھے۔ ۱۹۰۵ء سے لے کر اقبال کی نظرِ التفات کئی سال تک وطن کو چھوڑ کر بلادِ اسلامیہ۔ ملتِ اسلامیہ اور اتحادِ بین المسلمین کی طرف لگی رہی۔ ممکن ہے کہ ان کی توجہ کے مرکزِ وطن سے برگشتہ ہو جانے کی وجہ جنگِ عظیم اور اس وقت کے ہندوستانیوں کے حالات بھی ہوں لیکن ساتھ ہی ہم یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ اگر اس بیداری کی روح اور ساتھ ہی اس آزادی کی امنگ کا جو جنگِ عظیم کے اختتام پر ہندوستانی دلوں میں پیدا ہو گئی تھی ڈاکٹر صاحب کو قبل از وقت علم ہوتا تو وہ ہندو اور ہندی بھائیوں سے مایوس ہو کر اتحادِ بین المسلمین کو نصب العین نہ بنانے اور انہیں خاکِ ہند سے ایسی نفرت پیدا نہ ہوتی جیسی کہ مندرجۂ ذیل اشعار سے ظاہر ہے۔

از ہنر سرمایہ دارم کردہ اند   در دیارِ ہند خوارم کردہ اند

پیامِ مشرق

دیگر

او چمن زادے چمن پروردۂ   من دمیدم از زمینِ مردۂ

ناخواندہ فرزندانِ وطن جو ایک غلام ملک کے نمایندہ ہونے کی حیثیت سے جنگِ عظیم میں شامل ہونے کے لئے بھیجے گئے تھے انہوں نے جب آزاد ملکوں اور آزاد قوموں کو دیکھا تو انہیں آزادی اور آزادی سے مترتب ہونے والی برکات کے مقابلہ میں اپنی ذلت اور غلامی کا احساس ہوا اور جب وہ واپس ہندوستان آئے تو ان کے غیر تربیت یافتہ دماغوں میں غیر متشکل طور پر خواہشِ آزادی اور قومی عزت اور وقار کے جذبات جو موازنہ اور مقابلہ سے پیدا ہو گئے تھے موجود تھے۔ انہوں نے جو کچھ دیکھا تھا اسے یہاں اپنے بھائی بندوں میں بیٹھ کر بیان کیا جن سے ان خیالات کی نشر و اشاعت ہو گئی۔ اور جب ہندوستان نے اختتامِ جنگ پر اپنی خدمات کے صلہ میں عطائے حقوق کا مطالبہ کیا تو یہ خیالات جن کی درآمد یورپ سے ہوئی تھی اس تقاضا میں ممد ثابت ہوئے۔ تحریکِ عدمِ تعاون میں ہندوستان کی دیہاتی آبادی اور قصباتی آبادی کے ساتھ شامل تھی اور اس کے کامیاب تر بنانے کی وجہ دیہاتیوں کی شمولیت تھی اور ان کی اس شمولیت کا باعث محاذِ جنگ سے واپس آئے ہوئے کثیر التعداد دیہاتی فوجی تھے جنھوں نے غریب کاشتکاروں اور مزارعوں کو آزاد ملکوں کی کہانیاں سنائی تھیں۔ اگر اقبال کو یہ احساس ہو گیا ہوتا کہ ایک غلامانہ فعل کا بھی کوئی درخشاں پہلو ہو سکتا ہے تو شاید یہ ہماری خوش نصیبی کا موجب ہوتا لیکن تیرہ بختی نے ہمارا دامن نہ چھوڑا اگر ہندو مسلم اتحاد و اتفاق کے ان مناظر کا سلسلہ جو ۱۹۲۱ء اور ۱۹۲۲ء میں دیکھنے میں آئے تھے متواتر جاری رہتا اور بعد کے مناقشات اور فسادات کے سیاہ دھبے ابنائے وطن کی پیشانیوں کو داغدار نہ کرتے تو ہمارے شاعر کا قلب جس میں وطنیت کی اس قدر تڑپ موجود تھی ہم سے متنفر نہ ہوتا اور ایسی نظمیں نہ صرف تعداد میں ہی زیادہ بلکہ زیادہ جذبہ اور اخلاص سے لکھی جاتیں ایک اور بات جس نے اقبال کو ملیہ اسلامیہ کی طرف جھکا دیا یہ تھی کہ وطن کی پس ماندگی کے مقابلہ میں اسلامی ممالک میں بیداری کے آثار شدید طور پر

پیدا ہو گئے تھے اور ان کو خواب آلود ممالکِ اسلامی میں مصطفٰے کمال، آغا
رضا خاں پہلوی، امان اللہ خاں، زغلول پاشا، عبدالکریم اور ابنِ سعود کی
سی محب اور اولوالعزم ہستیاں نظر آنے لگیں اور یہ قدرتی بات تھی کہ
وہ ان کی طرف جھک جاتے اور اپنی قلمی سرگرمیوں اور کوششوں کو ایک
مردہ قوم کے احیا کے لئے صرف کرنے کی بجائے ایک ایسے مقصد کے
حصول کے لئے لگا دیتے جو مقابلۃً بہت وسیع تھا اور جس کی کامیابی کے
امکانات بھی زیادہ ہو گئے تھے۔

طلوعِ اسلام کے یہ دو پہلے شعر قابلِ ملاحظہ ہیں

دلیلِ صبحِ روشن ہے ستاروں کی تنک تابی
افق سے آفتاب ابھرا گیا دورِ گراں خوابی
عروقِ مردۂ مشرق میں خونِ زندگی دوڑا
سمجھ سکتے نہیں اس راز کو سینا و فارابی

اس کے علاوہ ایک اور بات جس نے اقبال کی توجہ حریتِ اسلامی
اور اخوتِ اسلامی ایسے مضامین کی طرف کھینچ لی اس زمانہ میں بوسیدہ قصرِ
خلافت کا انہدام تھا اس سے اسلامی ہندی دل متاثر ہو گیا۔
یہ اثر جو ہندی اقبال کو اسلامی اقبال میں بدل دینے کا ذمہ دار
بنا ایسے اشعار اور ایسی نظموں کا بھی محرک ہے جن میں وطنیت کو مذموم
قرار دے کر اتحاد بین المسلمین کی تعلیم دی گئی ہے۔

ان تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے
جو پیرہن اس کا ہے وہ مذہب کا کفن ہے
یہ بت کہ تراشیدۂ تہذیبِ نوی ہے
غارت گرِ کاشانۂ دینِ نبوی ہے
بازو ترا توحید کی قوت سے قوی ہے
اسلام ترا دیس ہے تو مصطفوی ہے

(وطنیت)

جن معانی میں اقبال نے وطنیت کو مذموم قرار دیا ہے وہ اُس
وقت پیدا ہوتے ہیں جب کسی خاص ملک کے رہنے والے اپنے ملک کو
باقی ممالک کے مقابلہ میں غاصبانہ اور جابرانہ طور پر ترجیح دیتے ہوئے
محبت کرنے لگیں۔ وطنیت کا مطلب یہ نہیں کہ ہم اپنے وطن کی خاطر
جابر بن جائیں اور باقی ممالک کے باشندوں کو بنظرِ حقارت دیکھتے ہوئے
ان پر حکومت کرنے کے خواہاں ہوں۔ میرے نزدیک جذبۂ وطنیت یا
حب الوطنی کا مطلب صرف یہ ہے کہ ہم اپنے ملک یا وطن میں آزادانہ
بغیر کسی مداخلت کے رہنے کو ترجیح دیں۔ حب الوطنی یا وطنیت سے
یہ مطلب نہیں ہوتا کہ ہم اپنے ملک کی خاک سے محبت کرتے ہیں بلکہ
اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ ہم صرف اُن حالات میں رہنے کو پسند کرتے
ہیں جن سے ہم بچپن سے مانوس ہو جاتے ہیں۔ ہم اپنی گرد و پیش
کی اشیا کو جو ہمارے افکار کا حصہ بن چکی ہیں اپنے قریب دیکھنا
چاہتے ہیں۔ ہم انہی لوگوں میں زندگی گذارنے کے متمنی ہوتے
ہیں جن کو ہم طفولیت سے اپنے ارد گرد دیکھتے آئے ہیں۔ اور
ہم وہی آب و ہوا چاہتے ہیں جو بوجہ پیدایش اور رہایش ہماری
طبیعتوں کے موافق ہو چکی ہے۔ ہماری طبیعت اس موسمی تغیر و
تبدل کو محسوس کرنے اور انہیں قدرتی نظاروں کو دیکھنے کے لئے
مچلتی ہے جو ہماری سرشت میں داخل ہو چکے ہیں۔ اس قسم
کے تمام احساسات اور جذبات کے مجموعہ کا نام وطنیت ہے۔ لیکن
اس کے لئے سیاسی اور اقتصادی آزادی لازمی ہے۔ اور بس۔ جغرافی
معانی میں ملک کرۂ ارض کا ایک حصہ ہے جو باقی حصوں سے بلحاظ
آب و ہوا اور محلِ وقوع مختلف ہو۔ لیکن نفسیاتی معانی میں ملک ان تمام
احساسات افکار اور جذبات کے مجموعہ کا نام ہے جو ایک خاص قطعۂ زمین
کے مقامی حالات سے دماغ میں تربیت پا کر ذہنیت کا حصہ بن جاتے
ہیں۔ ان معانی میں وطنیت یا حب الوطنی ایک فطری جذبہ ہے۔ اور
نہ صرف انسانوں میں بلکہ حیوانوں میں بھی پایا جاتا ہے۔ اس کے خلاف
دلیل لانا یا اس کو برا کہنا خلافِ فطرت ہے۔ اور یہ وطنیت اتحادِ
بین المسلمین خلایق دوستی اور حب العالمین کے مقاصد کی ضد
نہیں کہ اس کو برا کہا جائے کیونکہ ان معانی میں جو میں نے بیان
کئے ہیں آپ محب الوطن رہ کر بھی بنی نوعِ انسان کے بہی خواہ بن
سکتے ہیں لیکن چند اصولوں پر خواہ وہ کیسے اچھے اور پاکیزہ کیوں نہ
ہوں مختلف وطنوں کے لوگوں کو متفق کر کے وہ لگاؤ پیدا کرنا جو ایک وطن
کے باشندوں میں وطنی حالات سے خود بخود پیدا ہو کر قومیت کی
بنا ڈالتا ہے ناممکن ہے۔ اگرچہ ایک طرح کی ہمدردی پیدا ہو سکتی
ہے مگر اس باہمی ہمدردی سے جذبۂ وطنیت مردہ نہیں ہو سکتا۔
وہ بدستور برقرار رہ کر قومیت کے فرق کو قائم رکھتا ہے اگر وطنیت محض اس
لئے مذموم ہے کہ اس سے قوموں میں جبر کرنے کی خواہش پیدا ہو جاتی

ہے تو ایک مذہب سے مختلف قوموں کا جو ایک مرکب تیار ہوگا انجام کار اس میں بھی جبر کا عنصر داخل ہوگا۔ تجربہ اس کا ثبوت پیش کرتا ہے باوجود اس کے کہ تمام مذاہب حب الخلق کی تلقین کرتے ہیں ان کے پیرووں پر جبر و تشدد کرنے کے الزامات عاید کئے جاتے رہے ہیں۔ وطنیت ایک امر لازمی ہے اور اس کا کوئی نعم البدل نہیں۔ حسب ذیل شعر میں علامہ نے اتحاد بین المسلمین یا بین اسلامزم کو تمام ایشیا کی نجات اور آزادی کا واحد ذریعہ قرار دیا ہے۔

یہ نکتہ سرگذشت ملت بیضا سے ہے پیدا
کہ اقوام زمین ایشیا کا پاسباں تو ہے

حسب ذیل اشعار بھی بین اسلامزم کی تعلیم دیتے ہیں۔

ایک ہوں مسلم حرم کی پاسبانی کے لئے ✤ نیل کے ساحل سے لے کر تا بخاک کاشغر

دیگر

نسل اگر مسلم کی مذہب پر مقدم ہو گئی ✤ اڑ گیا دنیا سے تو مانند خاک رہگذر

دیگر

غبار آلودہ رنگ نسب ہیں بال و پر تیرے ✤ تو اے مرغ حرم اڑنے سے پہلے پرفشاں ہو جا

اسرار خودی اور رموز بے خودی کا مقصد اتحاد بین المسلمین کی تاسیس اور استواری ہے۔ اسرار خودی سے افراد ملت اسلامیہ میں احساس خودی پیدا کرکے ان کی شخصیتوں کو اکمل اور ان کے خیالات کو ارفع کرنا مقصود ہے۔ رموز بیخودی کا مطلب اختلاط افراد سے جماعت کی تشکیل اور پھر جماعت میں خودی کی تولید و تکمیل ہے پیام مشرق میں جن جذبات اور خیالات کا اظہار کیا گیا ہے۔ ان سے خودداری اولوالعزمی اور بلند نگاہی کا سبق ملتا ہے جو ایک پختہ مغز اور کامل انسان کی خصوصیتیں ہیں۔

اگرچہ بنفسہٖ طور پر ان تینوں کتابوں کا مقصد اتحاد بین المسلمین کی تعلیم و تدریس ہے لیکن ہندوستانی بھی ان سے استفادہ کر سکتے ہیں۔ کیونکہ ان میں کافی مسالا موجود ہے جس سے اعلیٰ قسم کے ایسے افراد پیدا کرنے کی غرض پوری ہو سکتی ہے جو ملک اور قوم کے لئے مفید ثابت ہوں اور جن سے عام سیاسی بیداری اور انبعاث عمل میں آ سکے۔ اولوالعزمی کا سبق کن روح پرور الفاظ میں دیا ہے۔

فارغ از اندیشۂ اغیار شو ✤ قوت خوابیدہ بیدار شو
سنگ چوں بر خود گمان شیشہ کرد ✤ شیشہ گردید و شکستن پیشہ کرد

دیگر

سنگ رہ آب است اگر ہمت قوی ست ✤ سیل را پست و بلند جادہ چیست
سنگ رہ گردد فسان تیغ عزم ✤ قطع منزل امتحان تیغ عزم

(اسرار)

برتر انسان کی عظیم الشان شخصیت اور قوت عمل کو بیان کیا ہے اور اس انداز میں کہ مردہ جسم میں بھی خون زندگی دوڑ جائے۔

مردے خوددارے کہ باشد پختہ کار ✤ با مزاج او بسازد روزگار
گر نسازد با مزاج او جہاں ✤ می شود جنگ آزما با آسماں
برکند بنیاد موجودات را ✤ می دہد ترکیب نو ذرات را

(اسرار)

"اسرار و رموز" اور "پیام" کے بعد زبور عجم شائع ہوئی۔ چند اشعار جو دلچسپی کا موجب ہوں گے اور جن سے شاعر کے نئے رجحانات کا مطالعہ بھی ہو سکتا ہے حسب ذیل ہیں۔

خود را کنم سجودے دیر و حرم نماند ✤ ایں در عرب نماندہ آں در عجم نماندہ

دیگر

یا رب بگردد آں ذوق انقلابے ✤ شاید کہ روز و شب را توفیق رم نماندہ
بے منزل آرمیدند یا از طلب کشیدند ✤ شاید کہ خاکیاں را در سینہ دم نماندہ

نہیں کہا جا سکتا کہ ان اشعار کے متعلق کیا کہا جائے یاس کی انتہا؟ لیکن اس کتاب کے آخیر میں "بندگی نامہ" ہے جو غلامی اور غلاموں کی مذمت ہے۔ ہم ہی غلام ہیں اور ہم ہی غلامی کرتے ہیں ایک طرح سے یہی سمجھنا چاہئے کہ ہمارا ہی رونا رویا گیا ہے اور یہ ہمارا ہی درد ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ ۱۹۱۵ء سے لے کر بعد کے کئی سالوں تک بظاہر ان کی توجہ اگرچہ وطن سے پھری رہی لیکن کبھی کبھی زخم ہرے ہو جاتے رہے اور وہ بلا واسطہ یا بالواسطہ طور پر خواہ مذمت ہی کے پیرایہ میں کیوں نہ ہو کچھ نہ کچھ درد کا اظہار کرتے رہے۔ "زبور عجم" کے اس شعر میں روئے سخن ہماری ہی طرف ہے

ترا ناداں امید غمگساری ہا ز افرنگ است
دل شاہیں نسوزد بہر آں مرغے کہ در چنگ است

غلامی سے پیدا ہونے والی ذلتوں کو بیان کیا ہے

از غلامی دل بمیرد در بدن ✤ از غلامی روح گردد بار تن

(زبور عجم)

دیگر

از غلامی بزمِ ملت فرد فرد ٭ این و آں با این و آں اندر نبرد

(زبورِ عجم)

غلام کی ذہنیت کو بیان کیا ہے۔

آبروئے زندگی در باختہ ٭ چوں خراں با کاہ و جو در ساختہ

(زبورِ عجم)

ان کا تازہ ترین کلام جو شائع ہوا ہے "جاوید نامہ" ہے۔ اس کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ہمارا بختِ خفتہ پھر بیدار ہوا ہے۔ کیونکہ اس میں ان رجحانات کا بشدت ثبوت ملتا ہے جن کی "زبورِ عجم" کے بندگی نامہ میں ایک ہلکی سی جھلک پائی جاتی ہے۔ شاید ہمارے بختِ خفتہ کی اس بیداری کی وجہ تحریکاتِ عدم تعاون اور سول نافرمانی ہوں۔ ان تحریکوں سے آزادی کی امنگ سینوں میں پھر پیدا ہو گئی تھی اس عام بعثت سے جو ان تحریکات سے عمل میں آئی وطن نے ابتدائی ہندی شاعر اقبال کی توجہ پھر جذب کی۔ اس کے ثبوت میں جاوید نامہ ایسے ایسے اشعار پیش کرتا ہے جن سے وطن اور اہلِ وطن سے ہمدردی کے خیالات کا اظہار ہوتا ہے۔ لیکن اب ان کا نکتۂ نظر صرف قومی اور ملکی نہیں بلکہ اس میں اُس مسابقت کی جھلک بھی موجود ہے جو "مجبورِ مشرق" کو "قاہرِ مغرب" سے ہے۔ اس کتاب میں انہوں نے ہندوستان کو اُن تمام مشرقی ممالک کے ساتھ شامل کر کے جو مغرب کے زخم خوردہ ہیں حب الوطنی اور دردِ قومی کا اظہار کیا ہے۔ چند اشعار خالی از دلچسپی نہ ہوں گے۔ طاغی جعفر اور غدار صادق کی روحوں کے متعلق کس نفرت سے فرماتے ہیں۔

جعفر از بنگال و صادق از دکن ٭ ننگِ آدم ننگِ دیں ننگِ وطن

وطن کی تعریف کرنے کے بعد کس نفرت سے ان غداروں کو غداری کے گناہِ کبیرہ کا مرتکب قرار دیا ہے۔

می ندانی خطۂ ہندوستاں ٭ آں عزیزِ خاطرِ صاحبدلاں
خطۂ ہر جلوہ اش گیتی فروز ٭ درمیانِ خاک و خوں غلطد ہنوز
در گِلش تخمِ غلامی را کہ کشت ٭ ایں ہمہ کردارِ آں ارواحِ زشت

مادرِ وطن کی اس سے زیادہ اور کیا تعریف ہو سکتی ہے اور اس کی بدنصیبی سے پیدا ہونے والے درد کا اظہار ان رقت خیز الفاظ سے زیادہ اور کس طرح کیا جا سکتا ہے!

آسماں شق گشت و حورے پاک زاد ٭ پردہ را از چہرۂ خود بر کشاد
در جبینش نارو نورِ لایزال ٭ در دو چشم او سرورِ لایزال
حلّہ در بر سبک تر از سحاب ٭ تار و پودش از رگِ برگِ گلاب
با چنیں خوبی نصیبش طوقِ بند ٭ بر لبِ او نالہ ہائے دردمند
گفت رومی روحِ ہند ست ایں نگر
از فغانش سوزہا اندر جگر

ہندوستان کے متعلق عام شکایت کرتے ہیں۔

شمع جاں افسرد در فانوسِ ہند ٭ ہندیاں بیگانہ از ناموسِ ہند

دیگر

تا شبِ ہندوستاں آید بروز ٭ مُرد جعفر زندہ روحِ او ہنوز

ہندی شاعر بھرتری ہری سے ملاقات ہوتی ہے تو کس بیتابی سے سوال کیا جاتا ہے۔

ہندیاں را دیدہ ام در پیچ و تاب
سِرِّ حق وقت است گوئی بے حجاب

کن محبت بھرے الفاظ میں سلطان شہید کی زبان سے دریائے کاویری کو مخاطب کیا گیا ہے

اے مرا خوشتر ز جیحون و فرات ٭ اے دکن را آب تو آبِ حیات

ہندوؤں اور مسلمانوں کے ہندوستان کے متعلق کس افسوس سے سلطانِ شہید دریافت کرتے ہیں۔

باز گو از ہند و ہندوستاں ٭ آنکہ با کاہش نیرزد بوستاں
آنکہ اندر مسجدش ہنگامہ مُرد ٭ آنکہ اندر دیرِ او آتش فسرد

سلطانِ شہید بے تابانہ دریافت کرتے ہیں۔

اے شناسائے حدودِ کائنات ٭ در دکن دیدی ز آثارِ حیات

کس امید اور توقع سے اس سوال کا جواب دیا ہے

تخمِ اشکے ریختیم اندر دکن ٭ لالہ ہا رُوید ز خاکِ آں چمن
رودِ کاویری مدام اندر سفر ٭ دیدہ ام در جانِ او سوزِ دگر

(جاوید نامہ)

اب یہ سب کچھ عرض کر دینے کے بعد میں کہوں گا کہ اتحادِ بین المسلمین سے علامہ کا مقصد کسی قسم کا سیاسی اتحاد نہیں بلکہ تمدنی و تہذیبی یک جہتی و یگانگت ہے۔ جہاں تک سیاسی اتحاد کا تعلق ہے دنیا کو ایک مرکز پر لانے کا نصب العین کیا مشرق اور کیا مغرب دونوں میں ناکام ثابت

ہو چکا ہے۔ مغرب میں قرون وسطیٰ میں اور بعد میں بھی اُنیسویں صدی تک اسقفِ اعظم کے ماتحت مسیحائی یورپ کو ایک عیسائی سلطنت میں شکل دینے کی انتہائی کوششیں کی گئیں۔ اور وہ اس حد تک کامیاب بھی ہو گئیں کہ پاپائے روم کے منشور اور احکام کی تمام عیسائی سلطنتیں بدل و جان تعمیل کرتی تھیں نیز اس کے اثر کے ماتحت یورپ بھر میں تمدنی یکجہتی اور یگانگت اس قدر بڑھی کہ اگر کوئی راہب روم سے چلتا تھا تو اسے ایڈن برا واقع سکاٹ لینڈ تک ہر ملک میں ہر جگہ خانقاہیں ملتی تھیں جن میں وہ قیام کر سکتا تھا۔ اسے ان خانقاہوں میں اس کے ہم مذہب اور ہم خیال اور اسی کی زبان یعنی لاطینی بولنے والے راہب ملتے تھے اور ان کی بود و باش۔ معاشرت۔ لباس۔ ذہنیت گویا کہ ہر چیز اسی سے ملتی تھی۔ اس ایک بات سے اس زمانہ میں یورپ کے مختلف ممالک میں جو تمدنی و تہذیبی یکسانیت کا عالم تھا اس کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ یہی حال مشرق کا تھا۔ یہاں اسلامی تہذیب کے تحت ترکی سے لے کر چین اور ہندوستان کی سرحدوں تک ایک ہی فضا پھیلی ہوئی تھی عربی کا چرچا تھا۔ ٹخنوں تک پاجامے لمبی داڑھیاں کٹی ہوئی لبیں یعنی صوم و صلوٰۃ کے پابند مسلمان ہر جگہ نظر آتے تھے۔ مکہ کے رہنے والے عرب ہندوستان کے شہروں میں اور ہندوستانی مسلم عرب اور فارس کے شہروں میں پھرتے نظر آتے اور اجنبی معلوم نہ ہوتے تھے۔ اور ان کو کبھی یہ احساس پیدا نہ ہوتا تھا کہ وہ ایک غیر ملک میں ہیں۔ جس طرح یورپ میں پوپ تمام عیسائی سلطنتوں کا مذہبی پیشوا تھا اس طرح مشرق میں تمام اسلامی ملکوں کا خلیفہ دینی رہنما و راہبر تھا۔ لیکن یہ دونوں تجربے جو مشرق و مغرب میں دو مختلف ذرائع سے کئے گئے آخر کار ناکام ثابت ہوئے اور ان کی ناکامی کی وجہ میرے نزدیک اصول کی غلطی نہیں بلکہ یہ ہے کہ اس اصول پر کاربند ہونے کے لئے وطنی خصوصیات کو نظر انداز کرنا فطرتِ انسانی کے لئے ناممکن ہو گیا تھا۔ مغرب میں اہلِ روم نے بوجہ اقتدار مذہبی و سیاسی اپنے کو ممتاز سمجھ کر دیگر ممالک کے باشندوں سے کچھ ایسا تحقیر آمیز سلوک کیا کہ اُن کے وطنی جذبات برانگیختہ ہو گئے اور بالآخر پاپائے روم کے اقتدار میں کمی کا باعث بنے۔ اسی طرح مشرق میں بھی عربوں نے اپنے اقتدار کی وجہ سے عربی و عجمی کا سوال پیدا کر دیا اور اپنے آپ کو اور برادرانِ اسلام سے ممتاز خیال کرنے لگے۔ اس سے توافق و تفریقِ وطن کا جذبہ جو اسلامی مساوات کی اولیں رو کے سامنے دب گیا تھا اس کے کمزور ہوتے ہی عربی تفاخر و تعلی کی وجہ سے پھر اُبھرا اور اس کے اُبھرتے ہی عربی اسلام کے خلاف قومی بغاوتوں کے علم بلند ہو گئے۔ ایران نے اس بارہ میں پیشقدمی کی۔

اب جبکہ مشرق و مغرب میں یہ تجربہ جو ایک وسیع پیمانے پر اور ایک طویل عرصہ تک ہوتا رہا ناکام ثابت ہو چکا ہے اس کے دہرانے کی کیا ضرورت ہے؟ قومیت جس سے ایک ایسے وسیع مقصد کو شکست ہوئی کیوں نہ اہل اصول تسلیم کر لیا جائے اور اس پر بین الاقوامی قصر کی بنیاد رکھی جائے۔ میرے خیال میں یہی علامہ کا مقصد ہے۔ اول حب الوطن پھر حُبّ العالمین یعنی پین اسلامزم یا ایسے کسی اور نصب العین کی بنیاد قومیت پر ہونی چاہیئے۔

کفایت علی

رباعی

خاموشی زندگی میں زمزمہ سحر کا
سرمایۂ رگِ جاں سے نغمے ہیں اپنے پیدا
ہے جامِ صنعت رونقِ مے خانۂ ہستی
انسان کا بازیچۂ گردش ہونا

سعید احمد اعجاز

شامِ نشاط

بہارِ نشاط و فروغِ شباب　پلا ساقیا بادۂ برق تاب
فضا نغمہ زار و ہوا مشکبار　اٹھا ساقیا ساغرِ زرنگار

پلا ساقیا بادۂ لعل فام　کہ رنگین ہوئی تیرے جلووں سے شام
سنا اے مطرب نغمہ پرداز سن　کوئی نغمۂ ظالم طربناک چھن
نہیں جوگ سے کوئی مجھ کو مذاق　کہ طے ہو چکی ہے بساطِ فراق
نہ ہے وصل کی شب رہے انبساط　کہ معمورِ عشرت ہے دل کی رباط
یہ حالت ہر گھر کی ہے سرِ شام سے　کہ طلعت ہے واں ہر در و بام سے
بچھا ساقیا آج پھولوں کا فرش　کہ شرمائے اپنے ستاروں پہ عرش

میسر ہے سامانِ بزمِ سرود　دف و بربط و مزمر و چنگ و عود
اٹھ اے ساقیٔ دلربا رقص کر　اٹھ اے مطربِ خوش نوا رقص کر
ہوئی آج مشکل محبت کی حل　سنا دے کوئی روح پرور غزل

اٹھائیں اگر آپ منہ سے نقاب　تو پھیکا پڑے چہرۂ آفتاب
بہت آستانوں پہ سجدے کیے　بہت کر دیا میں نے رسوا شباب
نہ کر آن سے ملنے کی اے دل ہوس　کہاں خس کہاں شعلۂ برق تاب
وہ بہکی ہوئی چال بیباک مست　وہ مہکے ہوئے گیسوئے مشکناب
انہیں جب سے دیکھا ہے عابد نے یوں　نہ آرام دن کو نہ ہے شب کو خواب

چمن زارِ دل میں بہار آگئی　بہار آگئی آشکار آگئی
دھڑکنے لگا سینۂ کائنات　ہوئی تیز رفتار نبضِ حیات
یکایک فضا گل بداماں ہوئی　یکایک تجلی نمایاں ہوئی
بدلنے لگا انتظامِ جہاں　کہ سورج ہوا رات کو ضوفشاں
وہ آئے جلو میں لیے نور کو　خبر دے کوئی جلوۂ طور کو
ہوا اُن سے پھر آمنا سامنا　مجھے ہم نشیں تھا منا تھا منا

ہوئی خاکساری مری سرفراز　ہوا ناز اُن کا اسیرِ نیاز
محبت کے نالے رسا ہو گئے　درِ بستۂ سعادت کے وا ہو گئے

نہ وہ بے قراری نہ دردِ جنوں　جنوں ہو گیا مایۂ دارِ سکوں
الٰہی ترا شکر ہے لاکھ لاکھ　کہ رکھ لی ہے ناچیز بندے کی ساکھ

تمنا کی نورس کلی کھل گئی
ترے فیض سے زندگی مل گئی

عابد لاہوری

محبّت

(ایک شکاری کی ڈائری کے تین ورق)

شکار میرا بہترین شغل ہے۔ مگر جب میں کسی جانور کو خون میں پھڑپھڑاتے دیکھتا ہوں تو میرا دل ڈوبنے لگتا ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے گویا وہ چلتے چلتے ابھی رُک جائے گا۔

اُس سال، خزاں کے آخری دنوں میں، سردیوں کا موسم یکلخت ہی شروع ہو گیا۔ میرے چچا موسیو راؤلی نے مجھ سے کہا۔ "دیکھو بیٹا کل صبح سویرے ہی دریا پر جانا اور ایک مرغابی مار کر میرے لیے لانا"۔

میرے چچا، تقریباً چالیس سال کے ایک خوش مذاق آدمی تھے۔ ان کا چہرہ سُرخ رنگ کا تھا۔ اور داڑھی بڑی گھنی اور بارُعب تھی۔ وہ گاؤں بھر میں سربرآوردہ اور معتبر سمجھے جاتے تھے۔ بعض دفعہ ان پر نیم حیوانی جذبات سوار ہو جاتے تھے۔ مگر اُن کا دل ہمیشہ ہشاش بشاش اور فرانسیسی نشاط پرور خیالات سے لبریز رہتا تھا۔ وہ گاؤں کی حویلی میں ایک دریا کی فراخ وادی کے کنارے رہتے تھے۔ ان کی حویلی کے دائیں بائیں ڈھلوان زمین پھیلی ہوئی تھی جس پر جنگل ہی جنگل نظر آتا تھا۔ یہ ایک قدیم جنگل تھا اور اس میں بڑے بڑے دیو قامت درخت دکھائی دیتے تھے۔ لوگوں کا خیال تھا کہ فرانس کا نایاب اور بہترین شکار یہیں پایا جاتا ہے۔ بعض اوقات وہاں عقاب کا شکار بھی کیا جاتا تھا، اور نقلِ مکان کرنے والے پرندے، جو ہمارے گنجان آباد ملک میں شاذ ہی نظر آتے ہیں، ان سال خوردہ درختوں کی بوسیدہ ٹہنیوں پر بیٹھ کر ہر سال اپنے پرانے مسکن کی یاد کو جو سالہا سال سے ان کا نشیمن بنا ہوا تھا، تازہ کیا کرتے تھے۔

اس وادی میں وسیع چراگاہیں تھیں، جو نہروں سے سیراب ہوتی تھیں۔ ان کو سطح کا نشیب و فراز ایک دوسرے سے علیحدہ کرتا تھا۔ اس حصے میں ندی کا پانی آہستہ آہستہ بہتا تھا اور آگے چل کر ایک وسیع و عریض پست زمین کو لبالب بھر دیتا تھا۔ یہی وہ جھیل تھی جس پر میرے چچا فخر کیا کرتے تھے اور ایک باغیچے کی طرح اس کی حفاظت کیا کرتے تھے۔

میں نے آج تک ایسی اچھی شکارگاہ کہیں نہیں دیکھی۔ سرکنڈوں کی گھنی پیداوار کے بیچوں بیچ، جو سمندر کی لہروں کی طرح شور مچاتے اور لہلہاتے رہتے تھے۔ اور جن کی جنبش میں زندگی کی روح موجزن دکھائی دیتی تھی انہوں نے گہری اور تنگ نہریں کھدوا رکھی تھیں، جن کے ساکن پانی کی سطح پر ہموار اور چوڑے پیندے والی کشتیاں، جو بانسوں سے چلائی جاتی تھیں چُپ چاپ تیرا کرتی تھیں۔ کسی کسی مقام پر وہ سرکنڈوں کو نیچے مسل دیتی تھیں اور آبی پرندے اور مچھلیاں، جو ان میں پناہ لیتے تھے، دلکش انداز کے ساتھ غوطہ لگا کر چشم زدن میں پانی کے اندر غائب ہو جاتے تھے۔

مجھے پانی سے بہت ہی رغبت ہے ——— سمندر، وسیع و عریض سمندر، تلاطم خیز سمندر۔ دریا، دلفریب دریا۔ گریزپا دریا، جن کا پانی تیزی سے آتا ہے اور تیزی سے بھاگ جاتا ہے۔ اور ان سب سے زیادہ جھیل جس کے ساکن پانی میں استوائی جانور چھپے رہتے ہیں ——— ! جھیل ربعِ مسکون میں ایک مختصر سی آباد دنیا ہے۔ اس میں جانور گھر بناتے ہیں، اس کے پاس سے مسافر گذرتے ہیں۔ اس میں جانوروں کی عجیب و غریب اور دلنواز آوازیں سنائی دیتی ہیں اور سب سے بڑھ کر اس کا پُراسرار وجود ہے۔ کبھی کبھی جھیل سے زیادہ استعجاب انگیز دہشت خیز اور خوفناک چیز بھی کوئی نہیں ہوتی ... آخر یہ تمام خوف پانی سے بھرے ہوئے ان اونچے نیچے میدانوں کے کس طرف سے پیدا ہوتا ہے؟ کیا سرکنڈوں کی سرسراہٹ سے؟ کیا یک از خود پیدا ہونے والے آزاد سکوت سے جو جھیل کی تمام کائنات کو رات کے وقت محیط کر لیتا ہے؟ کیا اُس شبنم سے جو بید کے پتوں کو سفید کفن کی طرح ڈھانپ لیتی ہے؟ اور کیا موجوں کے نرم نرم تھپیڑوں سے جو توپ یا رعد و برق کی آواز سے زیادہ خوفناک ہیں اور جن کی دعد آفریں

آوازیں جھیل کو خواب شیریں کے فردوس نظر شہر کی طرح ایک غیر حقیقی چیز بنا دیتی ہیں!

میں اپنے چچا کے گھر سرِ شام ہی پہنچ گیا۔ سردی اتنی شدت کی تھی کہ پتھر بھی منجمد ہو رہے تھے۔

وہ کمرہ جس میں ہم کھانا کھا رہے تھے بڑا وسیع تھا۔ اس کی دیواریں، چھت، اور الماریاں، اُن مردہ جانوروں سے اٹی پڑی تھیں جن کی کھالوں میں بھوسہ اور گھاس بھر کر انہیں مصنوعی طور پر زندہ کیا گیا تھا۔ کچھ جانور پھیلے ہوئے پروں کے ساتھ ایسی چست حالت میں تھے جیسے یہ ابھی اڑا چاہتے ہیں۔ کچھ لوہے کی میخوں سے سہارا لئے ٹہنیوں پر بیٹھے تھے۔ عقاب، بگلے، ابابیلیں، شکرے، شاہیں، مرغابیاں، گدھیں، اور میرے چچا، سمور دار کوٹ پہنے کیونکہ وہ بھی اس وقت سرد ممالک کا ایک عجیب و غریب جانور معلوم ہو رہے تھے کمرے کی زینت تھے۔ وہ مجھے بتا رہے تھے کہ انھوں نے شکار کے لئے کیا کیا تجاویز سوچ رکھی ہیں۔ مثلاً یہ کہ ہمیں صبح ساڑھے تین بجے ہی چل دینا چاہیئے، تاکہ شکار کی جگہ پر اولیں نشانوں کے لئے ساڑھے چار بجے تک پہنچ سکیں۔ وہاں ہم نے پہلے ہی سے برف کے تودوں کی ایک جھونپڑی طیار کرا رکھی تھی، تاکہ صبح کی یخ بستہ ہوا سے، جو آرے کی طرح جسم کو چیرتی ہوئی، اس پر سم آلودہ نیزہ کا سا اثر کرتی ہوئی، اس کو زنبور کی طرح کاٹتی ہوئی اور آگ کی طرح جلاتی ہوئی نکل جاتی ہے، ہمیں پناہ مل سکے۔

میرے چچا اپنے ہاتھ اچھی طرح ایک دوسرے پر ملتے ہوئے کہنے لگے۔

"میں نے اس سے پہلے کبھی اتنی شدید سرد ہوا چلتی نہیں دیکھی۔ آج شام تو ٹمپریچر درجۂ انجماد سے بھی بارہ درجے کم ہے"۔

میں کھانا کھا چکنے کے بعد فوراً بستر پر دراز ہو گیا۔ میرے کمرے کی انگیٹھی میں آگ دہک رہی تھی اس لئے جلد ہی مجھے نیند آ گئی۔ ٹھیک تین بجے مجھے جگایا گیا۔ میں نے بھیڑ کی کھال پہن لی۔ میرے چچا ریچھ کی سمور دار کھال اوڑھے ہوئے تھے ہم دونوں گرم گرم قہوے کے دو پیالے چڑھا کر اوپر سے شراب کی دو بوتلیں غٹ غٹ پی گئے۔ اور اپنے دربان، اور دو کتوں ——پلانگ اور پیری—— کو ساتھ لے کر روانہ ہو گئے۔

باہر قدم رکھتے ہی مجھے یوں محسوس ہوا، جیسے سردی میری ہڈیوں کے مغز تک سرایت کر رہی ہے۔ یہ اُن راتوں میں سے ایک رات تھی جبکہ لوگ شدتِ برودت کے باعث جام اجل پی لیتے ہیں یخ بستہ ہوا ٹھوس ٹھوس سی معلوم ہوتی تھی اور چھوئی جا سکتی تھی۔ وہ درختوں، پودوں، کیڑوں مکوڑوں، اور چھوٹے چھوٹے جانوروں کو جو ٹہنیوں پر سے سخت زمین پر گر رہے تھے اور سکڑ کر پتھر کی طرح سخت ہو رہے تھے، چیرتی، کاٹتی، مارتی، اور بے ہوش کرتی چلی جاتی تھی۔

چاند اپنے آخری ربع میں تھا —— کمزور، بے نور، زرد۔ وہ آسمان کے نیلے ٹکڑوں میں، جو بادل کے چھٹ جانے سے کہیں کہیں نمودار ہو گئے تھے، ساکن و جامد کھڑا تھا۔ وہ زمین پر دلسوز روشنی ڈال رہا تھا —— ایسی اندوہناک بے نور روشنی جو وہ ہر مہینے از سر نو زندگی حاصل کرنے سے پہلے ڈالا کرتا ہے ——!

ہم دونوں —— میں اور میرے چچا —— پہلو بہ پہلو، جیبوں میں ہاتھ ڈالے اکڑے سکڑے، اور بغلوں میں بندوقیں دبائے جا رہے تھے۔ ہمارے بوٹوں میں سے، جن کے تلے اون کے نمدوں سے ڈھکے ہوئے تھے تاکہ منجمد دریا پر پھسلنے سے ہمیں بچا سکیں، کوئی آواز پیدا نہیں ہوتی تھی۔ ہمارے کتوں کے مُنہ سے جو سانس نکل رہی تھی وہ سفید دھوئیں کی مانند دکھائی دیتی تھی۔

ہم جلد ہی جھیل کے کنارے پہنچ گئے اور ہم نے ایک ایسا راستہ اختیار کر لیا جو اس مختصر سے جنگل کو کاٹتا ہوا چلا جاتا تھا۔

ہمارے کندھے بوسیدہ پتوں کو چھو چھو کر ایک خاص قسم کی سرسراہٹ پیدا کر رہے تھے۔ مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا گویا اس سے پہلے میں نے کبھی ایسی جذبات پرور آواز نہیں سنی جیسی اس وقت پانی سے بھری ہوئی نشیب زمین میں اُگے ہوئے درختوں سے بلند ہو رہی تھی زمین جس پر ہم چل رہے تھے، کُہر، برف، اور اُفتادہ سرکنڈوں کے انبار کے نیچے دب جانے کے باعث بالکل مردہ ہو چکی تھی۔

ایک موڑ پر پہنچ کر اچانک میری نگاہ اُس برفانی جھونپڑی پر پڑی جو ہمارے ٹھہرنے کے لئے طیار کی گئی تھی۔ میں اس میں داخل ہو گیا۔ جانور ابھی جاگے نہیں تھے۔ اس لئے ہمیں وہاں ایک گھنٹہ انتظار

کرنا پڑا۔ میں نے اپنے جسم کو اچھی طرح چغے میں لپیٹ لیا تاکہ گرم ہو جاؤں۔ پھر میں بینچ کے بل لیٹ گیا۔ اور چاند کے زوال پذیر چہرے کی طرف دیکھتا رہا۔ مجھے اپنے تصور کے مطابق اس برفانی جھونپڑی میں سے چاند میں بہت سی شکلیں نظر آئیں۔ گرد و پیش کے منجمد پانی کی ٹھنڈک، دیواروں کی ٹھنڈک، اور آسمان کی ٹھنڈک میرے اندر لمحہ بہ لمحہ تیزی سے سرایت کر رہی تھی۔ میں کھانسنے لگا۔ میرے چچا راولی نے مضطرب ہو کر کہا:۔

"اگر ہم زیادہ شکار نہ بھی کر سکیں، تو مضایقہ نہیں، مجھے ڈر ہے کہیں تم کو سردی نہ لگ جائے۔ بہتر ہے کہ ہم آگ جلا لیں"۔

پھر انہوں نے دربان سے کہا کچھ سرکنڈے لے آؤ۔

ہم نے جھونپڑی کے درمیان سرکنڈوں کا ایک ڈھیر لگا دیا جھونپڑی کی چھت میں دھواں نکلنے کو ایک سوراخ بھی تھا۔ جب آتشیں شعلہ شفاف برفانی دیواروں کے درمیان سے اٹھتا تھا تو اس کا عکس برف کے پگھلے ہوئے پانی کی روانی کے ساتھ آہستہ آہستہ رقص کرتا تھا۔ اس وقت یوں معلوم ہوتا تھا جیسے آگ کی گرمی سے برف کے تودے پسینے میں شرابور ہو رہے ہیں۔

چچا راولی باہر کھڑے تھے۔ مجھے جلدی سے بلانے لگے۔

"آؤ! دیکھو"۔ میں باہر گیا۔ میری حیرانی کی کوئی حد نہ رہی جب میں نے دیکھا کہ ہماری مخروطی جھونپڑی ایک بہت بڑے شفاف ہیرے کی مانند معلوم ہو رہی تھی۔ اس کا مرکز سرخ رنگ کا تھا، اندر ہمارے کتوں کی دو شاندار صورتیں دکھائی دے رہی تھیں جو گرم ہونے کے لئے آگ کے پاس لیٹے ہوئے تھے۔

اچانک ہمارے سروں پر ایک آواز بلند ہوئی ——— ایک عجیب و غریب، غم آلود، وحشت انگیز آواز ——— ہماری آگ کی روشنی نے جانوروں کو جگا دیا تھا۔

کوئی بہک پرواز پرندہ نگاہوں سے دور خوشگوار ہوا کو چیرتا ہوا بے اندازہ بلندی پر، زمستان کی اولین شعاع کے شفق پر ظاہر ہونے سے قبل اڑتا چلا جاتا تھا، اس کی غم انگیز آواز نے میرے دل میں رحم و عفو کی ایک لہر دوڑا دی۔ مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا کہ صبح کے اس کہر آلود وقت میں ایک پرندے کے پروں کو ساتھ لئے یہ اڑتی ہوئی درد انگیز آواز ساری دنیا کے آلام کو اپنے اندر لئے ہوئے ہے۔

چچا بولے۔ "آگ بجھا دو۔ صبح ہو چلی ہے"۔

اور فی الواقع آسمان پر روشنی نمودار ہونے لگی۔ جنگلی بطخیں بڑی سرعت سے فضا میں پھڑپھڑاہٹ پیدا کرتی ہوئیں قطار در قطار ظاہر ہو کر چشم زدن میں غائب ہو جانے لگیں .... اچانک اندھیرے میں ایک برق انداز شعلہ نمودار ہوا۔ یہ راولی کا فائر تھا۔ دونوں کتے بے تحاشا بھاگ پھر ہم باری باری جب کبھی سرکنڈوں کے اوپر کوئی جانور یا اس کا سایہ ظاہر ہوتا۔ فائر کرنے لگے۔ ہمارے کتے بلانگ اور ہیری ہانپتے، کانپتے، انتہائی خوشی میں خون آلودہ جانور کو، جس کی آنکھیں ابھی ہمیں گھور رہی ہوتی تھیں، ہمارے پاس لے آتے تھے۔

صبح ہو گئی۔ آسمان صاف ہو گیا۔ سورج وادی کے دامن میں سے طلوع ہو گیا۔ ہم واپس لوٹنے کا خیال ہی کر رہے تھے کہ دو پرندے گردنیں باہر نکالے، پر پھیلائے، ہمارے سروں پر سے بجلی کی طرح گذرے۔ میں نے فائر کیا اور ان میں سے ایک عین ہمارے پاؤں پر آ رہا۔ یہ سفید چھاتی والی خوبصورت مرغابی تھی۔ پھر اوپر آسمان پر سے کسی جانور کی آواز بلند ہوئی ——— ایک نوحہ خیز، جگر پاش، بار بار پیدا ہونے والی آواز ——— آہ وہ پرندہ۔ وہ چھوٹا سا پرندہ جو بچ کر نکل گیا تھا نیلگوں آسمان پر چکر کاٹنے لگا اور اپنے مردہ ساتھی کو جسے میں نے ہاتھ میں پکڑ لیا تھا، حسرت بھری آنکھوں سے دیکھنے لگا۔ راولی جو اپنی بندوق گھٹنوں پر تھامے ہوئے تھے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اس کی طرف دیکھ رہے تھے کہ وہ بندوق کی زد میں آئے تو جھٹ سے فائر کر دیں۔ انہوں نے کہا

"تم نے مادہ کو مار ڈالا ہے۔ اب نر ہرگز نہیں جائے گا"۔ اور فی الحقیقت وہ نہ گیا اور ہمارے سروں پر منڈلاتا، چیختا چلاتا اڑتا رہا۔ آج تک کسی غمگین آواز نے میرے دل کو اتنا متاثر نہیں کیا جتنا اس تنہا پرندے کی دردآفریں آواز نے کیا۔

بار بار وہ بندوق سے ڈر کر بھاگ جاتا تھا اور آسمان کی طرف اونچا اڑ جاتا تھا اور جب وہاں تسکین نہیں پاتا تھا تو جلد ہی اپنی رفیقہ کو دیکھنے کی غرض سے نیچے کا رخ کر لیتا تھا۔

راولی نے کہا۔ "مادہ کو زمین پر چھوڑ دو۔ یہ فوراً ہی نیچے اتر آئے گا"۔

میں نے مادہ کو زمین پر رکھ دیا اور وہ میرے کینے سے بے نیاز ہو کر، اپنے ہم جنس کی بے پناہ محبت دل میں لئے، بہت جلد نیچے اتر آیا۔ راولی نے نشانہ باندھا میں نے ایک سیاہ چیز آسمان پر آویزاں دیکھی، اور مجھے یوں محسوس ہوا گویا ایک رسی تھی جس نے اس جانور کو تھام رکھا تھا اور وہ کٹ گئی ہے سرکنڈوں میں اس کے گرنے کی آواز آئی اور ہیری دوڑ کر اسے میرے پاس لے آیا۔

میں نے ان دونوں یخ بستہ جانوروں کو ایک ہی قبر میں سلا دیا۔

غزل

ہر وقت نوحہ خواں سی رہتی ہیں میری آنکھیں — اک دکھ بھری کہانی کہتی ہیں میری آنکھیں

عیش و طرب کے جلسے، درد و الم کے منظر — کیا کچھ نہ ہم نے دیکھا کہتی ہیں میری آنکھیں

جب سے دل و جگر کی ہمدرد بن گئی ہیں — غمگینیوں میں ڈوبی رہتی ہیں میری آنکھیں

لبریز ہو کے دل کا ساغر چھلک اٹھا ہے — شاید اسی سبب سے بہتی ہیں میری آنکھیں

ہر جنبشِ نظر ہے رودادِ عشق اختر
ہیں بے زباں مگر کچھ کہتی ہیں میری آنکھیں

(۲)

خیال کے گلستاں میں جانِ حزیں کو جھولا جھلا رہا ہوں — بھری ہے رنج و محن سے دنیا میں اس کو دل سے بھلا رہا ہوں

کبھی دلوں کو غم و مصیبت کے تذکروں سے رلا رہا ہوں — کبھی دماغوں کو عیش و عشرت کے قصے کہہ کر سلا رہا ہوں

پھر آرزوؤں کی دلفریبی پہ جان دینے لگا ہوں یعنی — میں اپنی راحت نصیب دنیا میں آفتوں کو بلا رہا ہوں

کبھی سنا تھا کہ جان ہوتی ہے کم سے کم قیمت اک نظر کی — اسی سبب سے میں جان دینے پہ زندگی بھر تلا رہا ہوں

ہوا نہ تھا کوئی میرے دکھ میں شریک اس کا نتیجہ یہ ہے
کہ دوسروں کے غموں میں اختر میں اپنی جاں کو گھلا رہا ہوں

اختر انصاری

بادل سے

شاعر لوگ فطرت کے دیوانے ہوتے ہیں سورج روز نکلتا ہے، چاند روز چڑھتا ہے، ستارے ہر رات ٹمٹماتے ہیں، ہوا ہمیشہ چلتی ہے، پھول کب نہیں کھلتے، پرندے کب نہیں گاتے، بارش کہاں نہیں برستی، قوس قزح کہاں نہیں بنتی لیکن ہم ــــ ہم دیکھتے ہوئے بھی نہیں دیکھتے۔ سنتے ہوئے بھی نہیں سنتے۔ مگر شاعر ــــ ! وہ ان نظاروں کو گھنٹوں بن اکتائے دیکھا کرتے ہیں اور پھر دیکھتے ہی نہیں ان سے ایسی راحت اور مسرت حاصل کرتے ہیں جس کی مثال نہیں مل سکتی۔ وہ انہیں دیکھ کر مست ہو جاتے ہیں، بے خبر۔ اسی مستی کی حالت میں وہ کبھی گانے لگتے ہیں اور کبھی ناچنے۔ ناچ تو قلم بند ہونے سے رہا پر گیتوں کو وہ ہمیں ورثہ میں دے جاتے ہیں۔ ایسے گیت ہمیں ہر ایک ادب میں ملتے ہیں۔ لیکن اس سلسلۂ مضامین میں میرا ارادہ سنسکرت زبان کے صرف اُن گیتوں کو اردو جامہ پہنانے کا ہے جو اشاروں کی شکل میں ہیں۔ ان میں مخاطب تو قدرتی اشیا کو کیا گیا ہے۔ لیکن اشارے انسان کی طرف ہیں۔ آج کل چونکہ رُت برسات کی ہے لہذا پہلے بادل کے بارے ہی میں لکھنا مناسب سمجھا ہے

فیاضی

اے بارانی بادل! کالا بھی تو ہمیں موسم سرما کے گورے بادلوں سے کہیں زیادہ پیارا ہے۔

اے فراخ دل برساتی بادل، پپیہا[1] تو تجھ سے حسب ضرورت چند قطرے ہی مانگتا ہے لیکن تو اپنی سخاوت سے ساری زمین کو سیراب کر دیتا ہے۔

اے رحم دل بادل! اس سڑک پر کے پیڑ کو وقت پر پانی پلا۔ مجھے علم ہے کہ یہ تجھ سے بہت دور ہے مگر اس کے سائے میں بہت سے مسافر آرام پاتے ہیں۔

مبارک ہے تیرا عروج، اے ابر! جس کے منہ کی طرف جنگل اور کوہسار بھی آنکھیں لگائے رہتے ہیں۔

آج کل کلپ برکش[2] نہیں، منہ مانگی مراد دینے والے دیوتا نہیں۔ پرانے معجزے اور کرامات بھی نہیں۔ اے ابر! آج کل تو ساری کائنات کا سہارا بس تو ہی۔

اے فیاض بادل ایک طرف تو تو ہے جو خلقِ خدا کی خدمت کے خیال سے سمندر کے آگے ہاتھ پھیلاتا ہے اور دوسری جانب خود غرض سمندری آگ ہے جو اسی پانی کو اپنے پیٹ میں ڈالے جاتی ہے۔

اے ابر! ابھی بوندیں زمین پر پڑیں نہیں ابھی تپش ہر طرف ویسی ہی ہے پھر بھی اے روح پرور! تجھے دیکھ کر کسانوں کے دل شگفتہ ہو گئے ہیں۔

کہاں نظر آئیں یہ ہری ہری بیلیں، کہاں کونپلیں، کہاں خوشبودار پھول اور کہاں میٹھے پھل، اگر یہ کشادہ دل بادل بِن مانگے ہی دان نہ دیتا پھرے۔

---

[1] پپیہا (سنسکرت نام چاتک) ایک پرندہ ہے جس کی نسبت مشہور یہ ہے کہ وہ صرف برسات کا پانی پی سکتا ہے۔ اگر وہ دوسرے پرندوں کی مانند چونچ سے پیئے تو وہ پانی اس کے گلے کے سوراخ سے باہر آ جاتا ہے لہذا برستی بارش میں چونچ بند کر کے وہ فضا میں منہ اوپر کی طرف کر کے اڑتا ہے۔ اس طرح جو بوندیں اُس کی گردن کے سوراخ میں گرتی ہیں ان سے وہ زندہ رہتا ہے

[2] سنسکرت ادب میں کلپ برکش اس درخت کا نام ہے جس سے مانگنے والے کو حسبِ خواہش ہر چیز دستیاب ہو سکتی ہے

آفتاب کی تیز دھوپ سے جھلستے ہوئے پہاڑوں کو اور جنگلی آگ سے جلتی ہوئی شکارگاہوں کو شانتی دے کر اور سوکھی ندیوں کو اپنے پانی سے سیراب کر کے اے ابر! خالی ہاتھ بھی تو کتنا خوبصورت لگتا ہے۔

اے مسافر! اس بھیانک کڑاک کو سن کر خوف سے لرز مت، کیا تجھے علم نہیں کہ یہ بادل ہے جو ہر دم دنیا کے دکھوں کو دور کرنے کے درپے رہتا ہے۔

گلہ

اے بادل! تم برستے ہو تو ساری کائنات ہری بھری ہو جاتی ہے، لیکن ہم آک کے پودوں کو پہلے پتوں سے بھی ہاتھ دھونے پڑتے ہیں۔

اے تنگ دل بادل! پیاسے پپیہے نے جتنے قطرے آنسوؤں کے اپنی فریاد کے وقت بہائے۔ اتنی بوندیں تو کم از کم تو نے اسے دی ہوتیں

اے احسان فراموش بادل! سمندر سے ہی پانی لے کر تو اونچا اٹھا ہے، اس پر بھی اس پر گرجتا ہے سو یہ کالا رنگ تجھے پھبتا ہی ہے

اے جل دھر[۱]! یا تو اس غضب کی گرمی کو موسلا دھار برس کر بھگا دے یا ہٹ جا۔ چاند کی اس چاندنی کو تو نہ روک

بنجر زمین میں تو نے پانی کی نہریں بہا دیں۔ پر زرخیز کھیت ترستے ہی رہے۔ یہ انوکھا انصاف تو نے کہاں سے سیکھا ہے اے ابر!

کہیں برسا ہوا پانی پانی ہی رہتا ہے۔ کہیں اس کا برسنا ہی بیسود ہوتا ہے۔ کہیں پر وہ زہر ہلاہل ہو جاتا ہے لیکن جہاں برسنے سے موتی بنتے ہیں وہاں سے تو بے پروا کیوں ہے اے بادل!

کتنی کڑی محنت سے دور ساگر سے تو پانی اٹھا کر لاتا ہے۔ پھر پیاسا کلپ برکش تو دیکھتا ہی رہ جاتا ہے اور تو بیابان میں برس پڑتا ہے کیا یہ برتاؤ تجھے سہاتا ہے اے بادل!

۱؎ بادل

گرج گرج کر تو نے سب سمتوں کو بہرہ بنا دیا ہے۔ پر افسوس! تجھ سے چاتک کی چونچ بھی نہیں بھری گئی۔

اے ابر! غریب کسانوں کے سوکھے کھیتوں کو چھوڑ کر اب تو فلک بوس کوہساروں پر اپنی سخاوت دکھانے لگا ہے۔ ٹھیک ہے، بلند مرتبے کو پا کر تجھ کو تمیز کرنے کا ملکہ نہیں رہا۔

جنگل کی آگ سے جلتے ہوئے اور تیز ہوا کے جھونکوں سے بھڑکتے ہوئے ان درختوں کو اے بادل! اگر راکھ ہونے سے نہیں بچاتا تو نہ سہی، مگر اے سنگدل! ان پر بجلیاں تو نہ گرا۔

گرمی کی شدت سے تالابوں کے پانی اُبل رہے ہیں، مچھلیاں کائی میں بھی تڑپ رہی ہیں۔ اے بادل! برسنے کا تو بس یہی سماں ہے بعد کو برسنا تو مُردوں کا سنگار کرنا ہے۔

یہ جو سنہری کونپل پھوٹی ہے، یہ جو گوناگوں پھول نکلے ہیں، اے ابر! یہ تیرے ہی فیض کی بدولت ہیں۔ مگر اب پھل لگنے کے وقت پانی نہ دیتے ہوئے کیا تو اپنے کئے کرائے پر پانی تو نہیں پھیر رہا!

ان درختوں کی جڑوں کو تو نے سینچا نہیں، چاتک کی چونچ تک بھیگی نہیں، جنگل میں جلتے ہوئے پیڑوں کو تو نے بچایا نہیں اے جل دھر! اور نہیں تو اپنے نام کی لاج تو رکھ لے۔

پپیہا

اے خوشامد کے خواہشمند بادل! کون نہیں جانتا کہ بیچارے چاتکوں کا سہارا صرف تو ہی ہے تو پھر ان کی پُر درد التجا کا انتظار کیوں کرتا ہے! اپنے آپ ہی برس پڑ۔

بے شک اس زمین پر سمندر ہیں، دریا ہیں اور کنوئیں بھی ہیں۔ مگر پیاسے پپیہے کو ان سے کیا۔ اے بادل! وہ تو تیری ہی راہ دیکھتا ہے

دوسرے جانور تو دریاؤں، نالوں اور چشموں سے پانی پی لیتے ہیں۔ مگر اے ابر! اس بے بس پپیہے کا تو ہی ایک آسرا ہے۔

اے جلد ھر! اگر پیاس کی شدت سے جاں بلب چاتک کو تونے چند بوندیں نہ دیں تو یاد رکھنا ابھی تھوڑی ہی دیر میں تجھے اس کے آگے پانی کے چلو دینے پڑیں گے۔[1]

اگرچہ ٹھنڈے میٹھے صاف اور خوشبودار پانی کی دنیا میں کمی نہیں تاہم پپیہے کا ننھا پانی کے لیے بادل ہی سے درخواست کرتا ہے۔

اے رحم مجسم! برسا، جلد برسا پانی کو۔ اب لمحہ بھر دیر کرنے کی بھی گنجائش نہیں ہے۔ اگر پپیہوں کا یہ خاندان آج تباہ ہو گیا تو بتا تو اس پانی کو کیا کرے گا۔

اے ابر! تو گرج رہا ہے مگر برستا نہیں۔ ادھر میں بے کل چاتک پیاس سے دم توڑ رہا ہوں۔ اگر بدقسمتی سے کہیں دکھن کی تند ہوا چل پڑی تو کون جانے تو کہاں ہوگا اور میں کہاں۔

اے ابر! اب چاہے پانی دے یا نہ دے یہ بھکاری چاتک تو اب تیرے ہی در پر ڈٹ گیا ہے۔ یہ تیرے در پر جان دے دے گا مگر دوسرے دروازے پر دستک نہیں دے گا۔

رام سروپ شاستری

قطعات

(۱)

شبِ غم پُر امید ہوتی ہے دل تڑپتا ہے آنکھ روتی ہے
تارے مجھ سے کلام کرتے ہیں چاندنی میرے ساتھ سوتی ہے

(۲)

بیخودی میں اسیر رہتا ہوں غم کو شادی سمجھ کے سہتا ہوں
لوگ جس کو فراق کہتے ہیں میں اسی کو وصال کہتا ہوں

(۳)

انجم و ماہ کہاں تک دیکھوں اثر آہ کہاں تک دیکھوں
کب تک آؤ گے یہ معلوم تو ہو اس طرح راہ کہاں تک دیکھوں

(۴)

عشرتِ ناز سمجھتا ہوں میں غم کا انداز سمجھتا ہوں میں
میری ہستی ہی تو ہستی ہے ضیاؔ
زیست کا راز سمجھتا ہوں میں

ضیاؔ فتح آبادی

---

[1] اپنے متوفی رشتہ داروں کو پانی کے چلو دینے کا رواج ہندوؤں میں زمانہ قدیم سے ہے۔

مایا

اس مایا کو تیاگ
رے پیارے!
اس مایا کو تیاگ

کیوں اس مایا پر مرتا ہے؟
کیوں مایا کا دم بھرتا ہے؟
کیوں "مایا" "مایا" کرتا ہے؟

تو نے اپنائی ہے مایا؟
مایا نے کس کو اپنایا؟
مایا چلتی پھرتی چھایا

یہ مایا ہے آگ
رے پیارے!
اس مایا کو تیاگ

اس مایا سے بھاگ
رے پیارے!
اس مایا کو تیاگ

او بھی بندے! مایا کس کی؟
کل اُس کی تھی اور آج اِس کی
کل کو اس سے بھی یہ کھسکی

مایا ہے بھگوان کی دشمن
یہ مایا ہے گیان کی دشمن
یہ مایا ہے جان کی دشمن

مایا ہے بے باگ
رے پیارے
اس مایا کو تیاگ

مایا زہری ناگ
رے پیارے!
اس مایا کو تیاگ

من، مایا سے اونچا کر لے
من کو ایشور پریم سے بھر لے
مایا تیرا من نہ ہر لے
مایا ہے کھڑاگ
رے پیارے
اس مایا کو تیاگ

امر چند قیس جالندھری

ایلس

تورگنیف کے "افسانہ ہائے خواب" میں سے ایک دلکش افسانہ

شام مافوق الفطرت قصے سنتے گزری تھی۔

رات زیادہ چلی گئی۔ میں سونے کے لئے لیٹ گیا۔ چاند پوری آب و تاب سے چمک رہا تھا اور دودھ سی سفید چاندنی ہر طرف بکھری ہوئی تھی۔ میرے سرہانے والی کھڑکی کھلی تھی کمرہ روشنی میں مسکرا رہا تھا!

دفعتہً کمرے میں ایک لطیف نغمہ گونجنے لگا۔ سارا کمرہ اس نغمے کے زیر و بم سے پُر ہو گیا! میں کہنی کے بل اٹھا۔ ادھر اُدھر دیکھا۔ کوئی نہ تھا "وسم بھی کیا چیز ہے"! میں دوبارہ بستر پر دراز ہو گیا۔ آنکھیں بند کر لیں۔

چند منٹ گزرے تھے کہ پھر وہی آواز کان میں آئی! میں خاموش لیٹا رہا۔ نغمہ زیادہ بلند اور تیز ہوتا گیا۔ میں نے آنکھیں کھول لیں سامنے ایک عورت کھڑی تھی۔ ساکت و سامت۔ سفید لباس میں ملبوس

میں نے کہا "تم کون ہو؟"

"میں تمہارے لئے آئی ہوں"۔

"میرے لئے"!

"ہاں جنگل کے کنارے شاہ بلوط کے درخت کے پاس مجھ سے رات کو ملنا!"

(۲)

دن بھر میں کچھ نہ کر سکا۔

رات ہو گئی۔ میں خیالات میں غرق بستر پر لیٹا ہی تھا کہ آواز آئی "تم آج کیوں نہیں آئے"۔

میں نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ وہی عورت۔ سفید۔ ساکت و سامت۔ اس نے میری طرف مسحور کن نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا "خدا کے لئے ضرور آنا"!

میں نے گھبرا کر جواب دیا "آؤں گا"!

سفید شکل دھواں بن کر بادل کے ایک ٹکڑے کی طرح اڑ گئی۔

(۳)

اگلا دن بھی میں نے بے چینی سے گزارا۔ سونے سے قبل خوب شراب پی۔ اور نشے میں چور ہو کر بستر پر لیٹ گیا۔

وہی آواز پھر سنائی دی مگر میں نے نظر اٹھا کر نہ دیکھا۔ آنکھیں بند کئے پڑا رہا۔ میں نے محسوس کیا کہ کسی نے مجھے زور سے پکڑ رکھا ہے۔ میں گھبرا کر اٹھ بیٹھا! وہی عورت میرے اوپر جھکی ہوئی تھی۔ وہ مسکرائی اور غائب ہو گئی!

(۴)

تیسرے دن صبح میں دیر سے اٹھا۔ اور تفریح کے لئے جنگل کی طرف چلا گیا۔ میں شاہ بلوط کے پاس گیا اسے غور سے دیکھا کوئی غیر معمولی بات نظر نہ آئی۔

شام ہو گئی میں اپنے دار المطالعہ میں کھڑکی کے سامنے بیٹھا تھا۔ سورج غروب ہو گیا تھا شفق کی روشنی نے افق پر ایک آگ سی دہکا رکھی تھی۔ گھاس پودے اور درخت سب خاموش کھڑے تھے۔ ہُو کا عالم تھا۔ دفعتہً ایک ننھی سی بھوری چڑیا میرے پاس کھڑکی کی دہلیز پر آ بیٹھی۔ اس نے مجھے غور سے دیکھا میں نے اُسے۔ شاید وہ مجھے شاہ بلوط کا وعدہ یاد دلانے آئی تھی!

رات ہو گئی۔ چاند طلوع ہو گیا۔ فضا کا سکوت ٹوٹ گیا۔ ہوا کے جھونکے چلنے لگے .... میں اسی طرح کھڑکی میں بیٹھا رہا۔ نوکر نے شمع روشن کر دی مگر ہوا کے ایک تند جھونکے نے اسے فوراً گل کر دیا۔

مجھے خیال آیا یہ سب یاد دہانی ہے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کوئی مجھے شاہ بلوط کی طرف کھینچ رہا ہے۔ میں اٹھا۔ ٹوپی اوڑھی اور جنگل کے کنارے شاہ بلوط کی طرف روانہ ہو گیا

(۵)

جب میں درخت کے نیچے پہنچا۔ بادل کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا چاند کے سامنے آگیا اور تاریکی چھاگئی۔

میں ڈرا۔ اِدھر اُدھر نظر ڈالی۔ وہ جھاڑی کے برابر کھڑی تھی۔ میں سہم گیا۔ میرا رونگٹا رونگٹا کھڑا ہوگیا۔ میں نے اپنے آپ کو سنبھالا اور اس کی طرف بڑھا۔

وہ ویسی ہی ساکت و سامت کھڑی تھی۔ اس کا جسم آئینہ کی طرح صاف شفاف تھا۔ صرف اس کی آنکھوں اور بالوں میں رنگ کی ایک ہلکی سی جھلک معلوم ہوتی تھی۔ اس کی انگلی میں سونے کی ایک انگوٹھی بھی تھی۔ اس کی نظریں میرے اوپر جمی ہوئی تھیں۔ اس کی آنکھیں پتھرائی ہوئی تھیں جن سے کسی جذبہ کا اظہار نہ ہوتا تھا۔

آخر میں نے ہمت کرکے کہا "میں آگیا ہوں"

"مجھے تم سے محبت ہے"

"مجھ سے محبت ہے!"

"ہاں اپنے آپ کو مجھے دے دو"

"اپنے آپ کو تمہیں دے دوں؟ کیونکر؟ تمہارے تو جسم ہی نہیں۔ تم ہو کیا؟ ہوا؟ بھاپ؟ دھواں؟ کیا تم کبھی زمین پر رہی ہو؟ تم کہاں سے آئی ہو؟"

"اپنے آپ کو مجھے دے دو میں تمہیں کوئی نقصان نہ پہنچاؤں گی صرف اتنا کہہ دو دیا"

میں نے اس پر ایک نظر ڈالی۔ آخر وہ کیا کہہ رہی تھی! وہ مجھے کیسے لے سکتی تھی۔

"اچھا دیا" دفعتاً آپ ہی آپ میری زبان سے یہ الفاظ نکل گئے

(۶)

اتنا کہنا تھا کہ وہ میری طرف لپکی۔ اس نے مجھے زمین سے اٹھا لیا اور ہم نے ہوا میں اڑنا شروع کیا۔ میرا سر چکرانے لگا اور میری آنکھیں بند ہوگئیں۔ جب میں نے آنکھیں کھولیں تو ہم زمین سے بہت اوپر پہنچ گئے تھے اور جنگل ہماری نظروں سے غائب ہوگیا تھا۔

"تم مجھے کہاں لے جا رہی ہو؟" میں نے اس سے پوچھا۔

"تم کہاں جانا چاہتے ہو؟"

"زمین کے قریب"

"اچھا آنکھیں بند کرلو"

میں نے آنکھیں بند کرلیں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ہم ایک کنکر کی طرح زمین پر گر رہے ہیں۔ جب میں نے آنکھیں کھولیں تو ہم زمین کے بہت نزدیک پہنچ گئے تھے۔ درختوں کی چوٹیاں ہمارے پیروں کو چھو رہی تھیں۔

"مجھے زمین پر اتار دو۔ چڑیوں کی طرح اڑنے میں کیا مزا ہے!"

اس نے کہا "ہمارے لئے پرواز کے سوا اور کوئی تفریح نہیں"۔

"آخر تم ہو کون؟"

وہ حسبِ معمول خاموش ہوگئی۔ اس نے اس سوال کا کوئی جواب نہ دیا۔ ہم زمین پر اتر گئے۔

اس نے کہا "دیکھو میں نے تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچایا۔ اب مجھے اجازت دو کہ تمہیں پھر لے چلوں۔ میں تمہیں زمین کے کناروں تک لے جا سکتی ہوں"۔

ہم نے پھر اڑنا شروع کیا۔ ہم جنگلوں اور دریاؤں کے اوپر اڑے چلے جا رہے تھے۔ اب مجھے بھی پرواز میں مزا آنے لگا تھا۔ میرے ہوش و حواس قایم تھے۔ میں نے اس کے چہرے کو غور سے دیکھا۔ اس کے چہرے پر حزن و ملال کی ایک ہلکی سی جھلک تھی۔

میں نے کہا "کیا میں تم سے کچھ دریافت کر سکتا ہوں؟"

"ہاں"

"تم نے ایک انگشتری پہن رکھی ہے۔ کیا تم کبھی زمین پر رہی ہو؟"

اس نے کوئی جواب نہ دیا۔

"تمہارا کیا نام ہے؟"

"میرا نام ایلس سمجھ لو"

"سمجھ لوں"

"ہاں"

"کیا تم مجھے پہلے سے جانتی تھیں؟"

"نہیں"

"پھر تم میرے پاس کیوں آئیں؟"

"مجھے تم سے محبت ہے"

"محبت! تو کیا تم اب اپنی محبت کی طرف سے مطمئن ہو؟"

"ہاں کیوں نہیں؟ ہم ساتھ ساتھ پرواز کر رہے ہیں۔ اور کیا

چاہیئے!

"کیا تم نے کوئی گناہ کیا ہے؟"

"میں نہیں سمجھتی تم کیا کہہ رہے ہو"۔

"خدا کی قسم ٹھیک بتاؤ؟"

اس نے تعجب سے کہا "خدا! میں نہیں جانتی تم کیا کہہ رہے ہو"

رات ختم ہو گئی۔ صبح قریب تھی۔ ہم زمین پر اتر آئے۔ وہیں شاہ بلوط کے پاس ابلیس غائب ہو گئی اور میں مکان چلا آیا۔

(۸)

اگلی رات جب میں شاہ بلوط کے قریب پہنچا تو ابلیس ایک قدیم دوست کی طرح مجھے خوش آمدید کہنے کو آگے بڑھی اس نے مجھے آغوش میں لے لیا اور ہم نے اڑنا شروع کیا۔

میں نے کہا "چلو آج اُدھر چلیں"۔

"میرے پیارے جہاں تم کہو یہ رات بڑی ہی اہم رات ہے۔ ایسی رات کبھی کبھار شاذونادر آتی ہے ....

... دیکھو ویرانوں کی دلدلیں۔ مینڈک ٹرا رہے ہیں۔ ہوا میں گندھک کی بو آ رہی ہے"۔

"آخر تم مجھے اس ویرانے میں کیوں لے آئی ہو؟ روم لے چلو"

"اچھا"

ہم نے ایک سڑک کے اوپر اوپر روم کی جانب اڑنا شروع کیا۔ چاروں طرف تاریکی تھی۔ دہشت ناک پرانے کھنڈر اپنے مکینوں کا ماتم کر رہے تھے۔ ہمارے نیچے ایک ٹوٹے ہوئے ایوان کے ستون استادہ تھے اور ادھر اُدھر شکستہ دیواروں کے نشان باقی تھے۔

ابلیس نے کہا "یہاں تین مرتبہ سیزر۔ سیزر۔ سیزر۔ پکارو"۔

میں نے کہا "پھر کیا ہوگا — سیزر! سیزر! سیزر!"

الفاظ میری زبان سے نکلے ہی تھے کہ فضا میں ایک شور و غل برپا ہو گیا۔ باجے گاجے تاشوں کی آواز سنائی دینے لگی۔ بگل بجنے لگے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ زمین کی لاانتہا گہرائیوں سے ایک جم غفیر اوپر اٹھتا چلا آ رہا ہے۔ سینکڑوں کروڑوں سائے ادھر اُدھر دوڑتے نظر آنے لگے۔ دفعتاً خاموشی چھا گئی۔ سب کھڑے کے کھڑے رہ گئے!

پھولوں کی مالا پہنے ایک معمر مگر طاقتور سر مجمع سے بلند ہونا شروع ہوا۔ شان و شوکت، صولت و جلال، رعب و دبدبہ، حکمرانی اور غرور، خوف اور دہشت اس کے چہرے پر برس رہے تھے۔

میں ڈر گیا۔ میں خوف سے کانپنے لگا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ میرا دم نکلا جا رہا ہے۔

میں نے کہا "ابلیس میں ہرگز یہاں نہیں ٹھہر سکتا۔ چلو چلو"۔

"ڈرپوک" ابلیس نے کہا اور ہم دونوں نے اڑنا شروع کر دیا

(۹)

ابلیس نے کہا "نیچے دیکھو"۔

سفید سنگ مرمر کا محل تھا۔ ساری فضا کسی مغنی آتش نفس کے جاں سوز نغموں سے متحرک رہی تھی۔ کل کائنات سو رہی تھی مگر مغنی اور اس کی آواز!!!

میں نے کہا "ابلیس یہاں لے چلو"

ہم محل کی کھڑکی کے نزدیک جا کھڑے ہوئے۔

وہ سامنے بیٹھی گا رہی تھی۔ سراپا شباب، حسن، رعنائی، نزاکت، نور اور نغمہ کا ایک حسین مرقع۔

میں لطیف نغموں کے زیر و بم میں کھو گیا۔ ہاں مجھے خودی کا احساس نہ تھا۔ حال اور ماضی کے تمام نقوش میرے دل و دماغ سے محو ہو گئے تھے۔ میں ابلیس کو بھی بھول گیا! میں نے چاہا کہ کھڑکی پر دستک دوں۔ مگر کسی نے میرا ہاتھ پکڑ لیا ....

ابلیس نے میری طرف غضب ناک نظروں سے دیکھا۔ کیا مجھے اور کسی سے محبت کرنے کی اجازت نہ تھی؟ ہم ہوا میں اڑنے لگے۔ مگر نغموں کا تلاطم ابھی تک میرے کانوں میں گونج رہا تھا۔

(۱۰)

"یہ ہے دریائے والگا کی وادی" ابلیس نے کہا۔

ہم پہاڑ کی ڈھلوان پر اڑتے چلے آ رہے تھے، نیچے دریا بہہ رہا تھا۔

"مارو، مارو، جانے نہ پائے۔ دریا میں پھینک دو، آگ لگا دو جلا دو۔ خاک کر دو۔ او خبیث کیا کر رہا ہے! گولی مار دو۔ آگ کیوں نہیں لگاتے۔ بدمعاش۔ ہاں ٹھیک"۔

میرے سامنے شعلے بلند ہونے لگے۔ ہوا گرم ہو گئی۔ فضا دھوئیں سے بھر گئی۔ خون کے فوارے اچھلنے لگے۔

"بھاگو۔ بھاگو" میں چلایا۔ میں ابلیس سے چمٹ گیا۔

ایک لمحے میں ہم اُسی درخت کے پاس آگئے۔

(۱۱)

اگلے دن میں نے اپنے نوکر کو بلایا۔ مجھے یقین نہ آتا تھا کہ دو تین رات سے اس طرح اڑتا پھر رہا ہوں۔ یہ سب خواب و خیال تو نہ تھا۔

"میں رات کس وقت سویا تھا؟"

"حضور مجھے تو کچھ معلوم نہیں۔ ان چار بجے میں نے دیکھا کہ آپ کپڑے اتار رہے تھے۔ اور کمرے میں اِدھر اُدھر چل رہے تھے۔"

"تمہیں خوب یاد ہے؟"

"جی ہاں۔ خوب"

"ویسے میری صحت کیسی ہے؟"

نوکر نے غور سے میرا چہرہ دیکھا۔

"حضور۔ یہ کیا آپ کا چہرہ تو بالکل زرد ہے۔"

"اچھا جاؤ۔"

نوکر چلا گیا۔ میں بیٹھا رہا میں نے سوچا واقعی دو تین رات سے میں ضرور اڑ رہا ہوں۔ یہ دھوکا نہیں۔ کل میں چار بجے کے قریب ہی واپس بھی آیا تھا اچھا میں آج درخت کے نیچے نہ جاؤں گا۔

(۱۲)

شام ہو گئی۔ رات ہو گئی۔ میں کمرے میں بیٹھا رہا......

مگر مجھ سے نہ بیٹھا گیا۔ مجھے درخت کا خیال آنے لگا اور ایلیس کا۔

میں نے ہر چند کوشش کی۔ مجھ سے نہ رہا گیا۔ میں نے ٹوپی اوڑھی اور درخت کی طرف چل دیا۔

وہاں کوئی نہ تھا!

میں گھبرا گیا۔ میں نے محسوس کیا کہ اب ایلیس کے بغیر رہنا ناممکن ہے۔ میں نے اِدھر اُدھر دیکھا۔

"ایلیس۔ ایلیس۔ تو کہاں ہے۔"

کسی نے جواب نہ دیا۔ میں افسردہ درخت کے نیچے بیٹھ گیا......

تھوڑی دیر میں پتوں کی آہٹ ہوئی۔ ہاں ایلیس آ رہی تھی اس نے مجھ کو کہا۔

"تم میری غیر موجودگی پر مغموم بیٹھے ہو۔ آؤ تم میرے ہو چکے!"

"تمہارا کیا مطلب ہے!"

ایلیس نے کوئی جواب نہ دیا

"کہاں لے چلوں؟"

"پیرس"

(۱۳)

میں نے پیرس پہلے بھی دیکھا تھا۔

آج بھی وہی پیرس تھا۔ جہاں سیم و زر اور حسن کی نمائش ہوتی تھی۔ حسن یہاں گھاس پھوس کی طرح اگتا تھا۔ مگر یہاں حسن و عشق کی دنیا عارضی تھی۔ غازہ اور پوڈر۔ نہ محبت تھی نہ خلوص۔

نیچے وہی پیرس کی پُر فضا چوڑی سڑکیں جن پر موم کی پتلیاں ریشم کا لباس پہنے محو خرام تھیں۔ شراب اور نفس پرستی کے نشے میں چور۔

"ایلیس میرا دم گھٹ رہا ہے!"

"کیوں!"

"تم نیچے اتر رہی ہو!"

"ہاں تم ہی نے کہا تھا کہ پیرس لے چلو!"

"میں اپنے الفاظ واپس لیتا ہوں۔ مجھے اس انسانوں کے چھتے سے دور لے چلو۔ میرا دم گھٹ رہا ہے!"

(۱۴)

ہم دریائے رائن کو طے کر کے جرمنی کی سیر کرنے لگے۔

ہر چیز محو خواب تھی۔ ہم اوپر اڑے چلے جا رہے تھے۔ زمین سے بہت دور، آسمان کے نزدیک، زمین ایک چھوٹی سی گیند تھی۔

"ایلیس وہ کیا ہے!"

دور زمین پر ایک اژدہا چل رہا تھا نہیں کوئی چیز لہریں مار رہی تھی۔ نہ اس کی کوئی شکل تھی نہ صورت۔ وہ مجسم ہیبت تھی! میں آسمانوں کی بلندیوں میں بھی کانپنے لگا۔ میرا دل لرز گیا۔ مجھ پر خوف کی سی بے ہوشی طاری ہونے لگی۔ ایلیس نے مجھے زور سے کھینچ لیا

میں نے کہا "ایلیس وہ کیا ہے"!

"موت ہے" الفاظ اس کے گلے میں اٹک گئے۔

ایلیس کا جسم ٹھنڈا ہو گیا اس کی قوتِ پرواز سلب ہو گئی۔ ہم نے زمین پر گرنا شروع کیا جیسے کسی نے بلند فضا سے زمین پر پٹک دیا ہو۔

ایلیس کا جسم اور بھی ٹھنڈا ہو گیا۔ ہاں بالکل برف۔

ہم اسی درخت کے پاس آ گئے۔ دفعتاً ایلیس غائب ہو گئی۔

(۱۵)

میں نے اِدھر اُدھر دیکھا چند گز کے فاصلے پر ایک نعش پڑی تھی۔

ایک حسین دوشیزہ کی نعش۔ شباب، رعنائی حسن، نزاکت، نور اور نغمہ سب اس پر قربان تھے وہ کون تھی؟ ایلیس! میں بھاگا اور جلدی سے اپنے کمرے میں داخل ہو گیا۔

جواد میرٹھی

غزل

چھپائی ہیں جس نے میری آنکھیں میں انگلیاں اس کی جانتا ہوں
مگر غلط نام لے کے دانستہ لطف اندوز ہو رہا ہوں

فریبِ تخئیل سے میں ایسے ہزار نقشے جما چکا ہوں
حقیقتاً میرا سر ہے زانو پہ تیرے یا خواب دیکھتا ہوں

پیام آیا ہے تم مکاں سے کہیں نہ جانا میں آ رہا ہوں
میں اس عنایت کو سوچتا ہوں خدا کی قدرت کو دیکھتا ہوں

ہر ایک کہتا ہے اوس میں سو کے اپنی حالت خراب کرلی
کسی کو اس کی خبر نہیں ہے کہ رات بھر جاگتا رہا ہوں

حسین ہو تم آپ کی بلا سے، پری ہو تم آپ کی دعا سے
جواب ملتا ہے سخت لہجے میں ان سے جو بات پوچھتا ہوں

ہلال اور بدر کے تقابل نے محوِ حیرت بنا دیا ہے
وہ عید کا چاند دیکھتے ہیں میں اُن کی صورت کو دیکھتا ہوں

شراب ساقی صراحی میخانہ قابلِ قدر ہوں، مجھے کیا
کسی کی آنکھوں کے سرخ ڈوروں سے پی کے مخمور ہو رہا ہوں

میں کیا کہوں گا وہ کیا سنیں گے وہ کیا کہیں گے میں کیا سنوں گا
اسی تذبذب میں شادؔ میں اُن کے در پہ ڈر ڈر کے جا رہا ہوں

شادؔ عارفی

دو تصویریں

بالکل دیہات تھا۔ شہر کی بو تک نہیں پہنچی تھی۔ نہ تو کوئی سبھا سوسائٹی اس کے سکون میں خلل انداز ہوتی نہ اخبار بیچنے والے جھگڑے فساد کی سنسنی خیز خبریں سنا کر لوگوں کے کان کھڑے کرتے ہاں ووٹ کے زمانے میں ضرور دو ایک بار گاؤں میں موٹر آجاتی۔ لڑکے اس کو دیکھ کر شور و غل مچاتے اور تھوڑی دور تک اس کے پیچھے بھاگتے۔ بڑے بوڑھے بھی اس پر متعجب نگاہیں ڈالتے۔ عورتیں بھی "بھوں پوں" کی آواز سن کر کھانا پکانا چھوڑ کر ٹٹیوں میں سے دیکھنے لگتیں۔

تھوڑے عرصے سے گاؤں کے مکھیا بھلّو ٹھاکر کی کوشش سے ان ووٹ کے امیدواروں کے ہاتھ پیر جوڑنے سے ایک پرائمری اسکول بھی کھل گیا۔ منوہر گرو جی جو لڑکوں کو گنتی پہاڑا سکھاتے تھے کچھ پاس نہ رہنے کے باعث اسکول میں نہ رہ سکے۔ اور باہر کے دو ماسٹر صاحبان جن کا نام لینے میں کچھ جدت اور بڑائی کا اظہار ہوتا تھا پڑھانے کے لئے مقرر کئے گئے۔

لڑکوں کو پیپل کے نیچے نہیں بلکہ ایک بنگلہ نما مکان میں بنچ پر بیٹھنے کا موقع ملا۔ دودھیا اور تختی کی جگہ پر سلیٹ، بورڈ اور چاک بھی آگئے۔ رنگ برنگے نقشے بھی دیواروں پر لٹکا دیئے گئے۔

گرو جی کی پاٹھ شالا ابھی بالکل خالی نہیں ہو گئی تھی۔ ہاں بھلّو ٹھاکر کا لڑکا اوما اور دیا شنکر ٹھکرائی کا بھتیجا جنو اور دوسرے بہت سے لڑکے اسکول میں داخل ہو گئے تھے۔ "سینچرا" میں سیروں چاول اور کئی پاؤ گڑ کی کمی ہو گئی تھی۔ پھر بھی منگو، بینی، کشن وغیرہ کئی لڑکے اب بھی تختی لے کر بھور ہوتے ہی برگد کے نیچے آجاتے اور چلّا چلّا کر پڑھنا شروع کر دیتے۔

لیکن اب وہ میل ملاپ دور ہو گیا تھا۔ ایک ہی ساتھ ترنگ مچانے والے، ساتھ ہی ساتھ گلی ڈنڈا کھیلنے والے اور ایک ہی جگہ بیٹھ کر بیچ حصہ کر آم کی کونپلیں کھانے والے الگ ہو گئے تھے۔ دیوار کا اسکول ٹُٹی کی پاٹھ شالہ کو ذرا منہ بنا کر دیکھنے لگا۔

✻ ✻ ✻ ✻ ✻

اس روز اتوار تھا۔ آج اسکول بند تھا۔ اور پاٹھ شالہ بھی نہیں تھا۔ اوما کانت اپنے ساتھیوں کے ساتھ ندی کنارے پہنچا۔ گاؤں کے پچھم بل کھاتی ہوئی ندی بہہ رہی تھی۔ نیا پانی آگیا تھا بڑی کشتیاں جو پانی کی کمی کی وجہ سے کنارے پر بیکاری کے دن کاٹ رہی تھیں اب کام پا کر ادھر اُدھر دوڑنے لگیں۔ لڑکے کنارے پر بیٹھ کر ہاتھ پاؤں بھگونے اور کلیلیں کر کے پانی اچھالنے لگے۔

منگو بھی اپنی پھٹی ہوئی دھوتی پہنے وہاں موجود تھا۔ اوما کو دیکھ کر خوشی خوشی اسی گروہ میں جا ملا اور شوق سے ان کی باتیں سننے لگا۔

بات ہو رہی تھی کہ ندیاں دکھن ہی کی طرف کیوں بہہ رہی ہیں۔ اوما سمجھا رہا تھا کہ ہمالہ بھارت کے اُتر میں ہے اور اس صوبے کی زمین اونچی ہے۔ دکھن کے حصے میں ہموار میدان ہے جو پچھم سے پورب کی طرف ڈھالو ہے۔ یہی وجہ ہے کہ گنگا پچھم سے بنگال کی کھاڑی میں گرتی ہے۔ اور یہ اُتر کی ندیاں گنگا ہیں۔ اسی سلسلے میں اس نے زمین کی گولائی اور حرکت کے بارے میں جو سبق پڑھا تھا اس کا خلاصہ بھی سنا گیا۔ حالانکہ منگو کی نظروں میں اپنے کو زبردست معلومات رکھنے والا ثابت کرنے کے سوا اس سے اس کی اور کوئی غرض نہ تھی لیکن بات الٹی ہو گئی۔

زمین کا گول ہونا منگو کے ذاتی تجربہ کے خلاف تھا اور زمین کے گھومنے کی بات تو پہاڑ کے اڑنے کی طرح اَن ہونی تھی ۔۔۔۔۔ صاف دیکھتے ہیں زمین جہاں کی تہاں ہے۔ ہم بھی ایک ہی جگہ پر ہیں۔ ذرا بھی ٹس سے مس نہیں ہوتے۔ پھر ایسا کہنا تو سیدھے آنکھ میں دھول جھونکنا ہے۔

منگو سے رہا نہ گیا۔ بول اٹھا ۔۔۔۔۔ بھائی یہ کیا کہتے ہو؟ زمین تو بالکل چپٹی ہے یہ گول کیسے ہو سکتی ہے! پھر اس کا چلنا تو اور بھی غضب کی بات ہے!"

یہ بات سن کر سب لڑکے اس کی طرف دیکھنے لگے۔ اُن کی

آنکھوں میں بھی یہی سوال تھا۔

اپنی ہمہ دانی کو ایک بے سمجھ مہنگو کے ذریعہ یوں برباد ہوتے دیکھ کر اوما کا مزاج گرم ہو گیا۔ اس نے طعن سے کہا — "رہنے دو یہ اندھا خیال کہ سورج گھومتا ہے اور زمین کچھوے کی پیٹھ پر جیوں کی تیوں ٹکی ہوئی ہے۔ ارے بے وقوف! سورج نہیں گھومتا زمین ہی اس کے چاروں طرف گھومتی رہتی ہے۔"

مہنگو روز سورج کو پورب سے پچھم کی طرف جاتے دیکھتا ہے اور ایک بار نہیں سینکڑوں بار گرو جی کے منہ سے سن چکا ہے کہ دن کر مہاراج جب اُدے اچل پر آتے ہیں تو دن ہوتا ہے۔ اور ان کے استاچل جانے پر رات ہوتی ہے۔ بھلا یہ بات کیسے ہو سکتی ہے! پرتھوی کا گھومنا کیسا! اور اس پر چاک کی طرح! پھر ہم لوگ چکر کھا کر گرتے کیوں نہیں؟"

وہ چپ نہ رہ سکا بول اٹھا — "واہ یہ کیسا! کیا سچ مچ تم گرو جی کی باتیں بھول گئے! لو تھا ارُون کا سات گھوڑے والا رتھ ہانکنا۔ دن کر کی اُدیاچل۔ استاچل والی یاترا — ! جب ہی تم انٹ سنٹ بکنے لگے۔"

اوما کانت آگ بگولا ہو کر بولا — "ارے انٹ سنٹ باتیں تو تمہاری چٹ سار میں پڑھائی جاتی ہیں۔ یہاں تو بالکل کتاب کی چھپی ہوئی پڑھائی ہے۔ نقشے اور گلوب سے ثابت!"

مہنگو ویسے تو چپ بھی رہ سکتا تھا لیکن اپنی پاٹھ شالہ کی بے عزتی سہنا اس کے قابو سے باہر تھا۔ وہ یکایک آپے سے باہر ہو گیا۔ "رہنے دو اپنا سکول اور اپنی کتاب۔ اگر ایک سوال پوچھ بیٹھوں تو نانی مر جائے پھر پرتھوی کا چکر کاٹنا بھی بھول جائے گا۔"

اب مہنگو کی باتوں کا جواب اوما کی نگاہ میں زبان سے نہیں ہو سکتا تھا۔ جھٹ اس نے اس کی گردن پکڑ لی، اور دھکیل دیا۔ ندی کی موجیں بالکل نیچے ٹکرا رہی تھیں۔ مہنگو سنبھل نہ سکا۔ ندی میں جا پڑا۔ ندی کی موجوں نے اسے ہاتھوں ہاتھ بیچ میں پہنچا دیا۔ خوش نصیبی سے مہنگو تیرنے میں طاق تھا۔ اور حسن اتفاق سے ایک کشتی بھی آ رہی تھی۔ اس نے ملاح کی مدد سے اوپر آ گیا۔ لیکن چند گھونٹ پانی پی ہی گیا تھا۔

آج منگو اوما کے متعلق برابر سوچتا رہا۔ آج سے پہلے کی کتنی ہی باتیں آج اس کی آنکھوں کے سامنے ایک ایک کر کے آنے لگیں۔ اوما کے ساتھ امرود کے پیڑ پر چڑھنا، گلی ڈنڈا کھیلنا، پاٹھ شالہ میں لکھنے کی تختیوں کو دھونا اور بھنگریا کے پتوں سے رگڑ رگڑ کر رنگنا، سوال پوچھے جانے پر اوما کا چالاکی سے اس کا جواب بتا دینا۔ اور آج پھر اس لنگوٹیے یار کی آنکھوں کا یہ رنگ! یہ بے مروتی!

مہنگو نے اس رات اپنے بچھونے کو آنکھوں کے پانی سے بھگو ڈالا — لیکن کسے معلوم کہ آج کے واقعے کا خیال کر کے یا پچھلی باتیں یاد کر کے؟

+ + + + +

اس واقعے کو ایک زمانہ گزر گیا۔ مستقبل کے کتنے دن ماضی کی آغوش میں جا سوئے تھے۔ بچے جوان، جوان ادھیڑ، ادھیڑ بوڑھے اور بوڑھے زندگی کی آخری منزل طے کر رہے تھے۔ ہمارے اوما بابو اب بچے نہیں رہے۔ چوبیس برس کے نوجوان تھے۔ مہنگو بھی بال بچوں والا ہو چکا تھا۔

گاؤں بھی اپنی پوشاک بدل چکا تھا۔ چوکی صندوق کے بجائے کرسی، میز اور الماریوں سے اس کے گھر سجنے لگے۔ جہاں تار پڑھوانے کے لئے دور شہر میں جانا پڑتا تھا، وہاں تار لکھنے والے ہی نہیں کتنے تار بابو بھی بن چکے تھے۔ جہاں سائکل دیکھنے کے لئے بھیڑ لگ جاتی تھی وہاں اب موٹر بھی اپنے اندر کوئی دلکشی نہیں رکھتا۔ پوسٹ آفس اور چھوٹا سا ہسپتال بھی کھل گیا۔ مسٹر اوما کانت مصر بی۔ اے کی کامیاب سعی سے ہر حیثیت سے گاؤں شہر کی برابری کر رہا تھا۔

ندی اپنی اسی رفتار سے گاؤں کے پچھم بہہ رہی تھی۔ اس میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ مہنگو بھی اپنی پرانی چال سے چل رہا تھا۔ غریب تھا۔ غریبی کی سادی زندگی بسر کرتا۔ ایک جوڑا بیل، دو گائیں، چار بیگھے زمین اور اپنی محنت یہی اس کی پونجی تھی۔

کماتا، کھاتا، بے فکر سوتا۔ ہاں! کبھی کبھی اوما بابو سے ملاقات ہوتی تو سلام بندگی کرتا اور ان کے خاموش اشارے پا کر ایک طرف ہو جاتا۔ بچپن کی باتیں یاد آتیں تو دل بھر آتا۔ آہ! کیسے تھے وہ دن! کیسی پیاری تھی وہ زندگی!

+ + + + +

ندی میں باڑھ کی نئی جوانی آئی۔ وہ دیوانی اٹھی مچل اٹھی۔ ہلوریں

لینے لگی۔ آس پاس کے پودے اس کی متوالی دھارا میں ڈوبنے لگے ندی فرطِ مسرت سے موجوں کی ڈنڈیوں کے ذریعے جل ترنگ بجانے لگی ——— لوگ اسے سننے کے لئے جمع ہونے لگے۔

اس روز شام کا سہانا وقت تھا۔ سورج کی سنہری کرنیں ندی کی چنچل موجوں سے اٹھکیلیاں کر رہی تھیں۔ اوما کانت بابو بھی چند دوستوں کے ساتھ ایک سجی سجائی ناؤ میں بیٹھ کر سیر کر رہے تھے۔ باری باری دوستوں کی جماعت چپو چلا رہی تھی۔ کشتی ندی کے فرش پر ناچتی چلی جا رہی تھی۔ ہنسی مذاق سے فضا گونج رہی تھی۔ کبھی کبھی کنارے سے بھی "تائی ڈبر" "ٹائی لو" کی آوازیں آ جاتی تھیں۔

یکایک کشتی بھنور کے قریب جا پڑی۔ وہ کہاں اور کدھر بہکتی جا رہی تھی! کسی کو یہ سوچنے کی فرصت ہی نہ تھی۔ یکایک بھنور کے کنارے کشتی رکی۔ پھر ایک طرف جھک گئی۔ اُما بابو کنارے پر بے احتیاطی سے بیٹھے تھے سنبھل نہ سکے۔ کشتی بھی اس وقت سنبھالی گئی جب وہ لڑھک کر ندی میں جا چکے تھے۔

ہل چل مچ گئی "ارے دوڑو..... بچاؤ..... کودو..... نکالو..... آہ! اوما بابو!..... آہ! ڈوب رہے ہیں..." کا شور ہونے لگا لیکن شور و غل مچانا تو آسان تھا کود نا اپنے کو موت کے حوالے کرنا تھا کون کودے! کون جان پر کھیلے! کشتی بغیر چپو کی ہو گئی بہاؤ پر ہونے کے باعث بہہ نکلی۔ اب بیہوش اُما بابو کے کانوں میں آواز بھی نہ آتی تھی۔

کنارے پر ایک آدمی بیل کو پانی پلا رہا تھا۔ اس کے کانوں تک آواز پہنچی۔ وہ چھپاک سے کود پڑا تیرنے میں طاق تھا۔ چند منٹوں میں ڈوبنے والے کے پاس پہنچ گیا۔

کسان اسے پیٹھ پر لادے خود ڈوبتا ترتا موجوں سے لڑتا بھڑتا کنارے آ ہی پہنچا۔ پانی پیتے پیتے وہ بھی بے دم ہو گیا تھا۔

بہت دیر کے بعد جب اُما کانت کی آنکھیں کھلیں تو دیکھا کہ منہگو کے سینے پر ان کا سر ہے! آہ! کیسا منظر ہے! وہی بچپن کی تصویر!!

منہگو نے دیکھا۔ ان کی آنکھوں سے آنسو جھڑ رہے ہیں۔ لیکن نہ جانے کس دن کی یاد میں یہ موتی پروئے جا رہے ہیں۔

دونوں ایک دوسرے سے چمٹ گئے ——— ایک بار پھر دونوں آنسوؤں کے سیلاب میں ڈوبنے ترنے لگے!!

آسی رام نگری

رہنما

ہماری دنیا ہر لحظہ تبدیل ہوتی رہتی ہے۔ قدیم درسگاہوں پر نکتہ چینیاں کی جا رہی ہیں ماضی کی تکمیل یافتہ طاقتیں اپنی بنیادوں کو لرزاں پا رہی ہیں۔

ہمارے تمدن میں کوئی تضحیک آمیز خامی پوشیدہ ہے۔ ہم اس سے آگاہ ہیں۔ ہم آمادۂ عمل ہیں۔ یہ احساس تمام ملک میں پھیل چکا ہے ہم اس دنیا کو بلحاظ مسرت و صحت رہنے کے قابل بنا دیں گے لیکن ہماری رہنمائی کون کرے گا؟

دو ہزار برس گذرے کسی حکیم نے کہا تھا "ان کی رہنمائی ایک ننھا بچہ کرے گا"

کیا یہ ہماری موجودہ ضرورت کا جواب ہو سکتا ہے!

ہم نے مندرجہ بالا قول بارہا سنا ہے۔ ہم نے اس کی مذہبی خصوصیت کی تعریف کی ہے لیکن زندگی میں اس کی عملی حیثیت پر بہت کم غور کیا ہے۔

ایک بچہ رہنمائی کرے گا۔

امتدادِ زمانہ اس قول کی صحت پر اثر انداز نہیں ہو سکا۔

کیونکہ ہمارے بچوں کی ضروریات وہ قوت ہیں جو عموماً تعمیری ہوتی ہیں۔

تم کہوگے کہ زمانے کی اہم ترین تحریکات بچوں کی ضروریات کا نتیجہ تھیں۔

ہر نسل اپنے بعد آنے والی نسل کے لئے دنیا کو بہتر بنانے کی جد و جہد کرتی ہے جب کوئی ہوشمند سیاست دان ملکی قوانین میں اصلاح کی کوشش کرتا ہے تو اس کی اولیں توجہ قوم کے بچوں پر صرف ہوتی ہے۔

وہ اس طرح مستقبل کی جس میں بچے مرد اور عورت بن جائیں گے تعمیر کرتا ہے والدین اپنے اور اپنے متعلقہ لوگوں کے لئے مکان تعمیر کرتے ہیں جن میں ان کے بچے جوان ہوں گے، زندگی گذاریں گے۔ اس لئے ہر تجویز جس سے انسانیت کی بہتری مقصود ہوتی ہے بچوں کی ضروریات سے متاثر ہوتی ہے۔ بچے کی ضروریات رستہ بتاتی ہیں اور جب ہم اس قدرتی میلان پر عمل کرتے ہیں جس کا مقصد اقتصادی معاشرتی یا سیاسی الغرض ہر لحاظ سے بچے کا مستقبل بنانا ہے تو گویا ایک عظیم الشان قوم جس کی قوت یقینی اور مستحکم ہو گی تعمیر کرتے ہیں۔

(ترجمہ) لطیف انور گورداسپوری

غزل

وہ آکے سامنے جس وقت مسکراتے ہیں
ہم اُن کی ساری جفاؤں کو بھول جاتے ہیں

جفا پہ اُن کی وفا کا گماں گذرتا ہے
کچھ اس طرح وہ مرے دل کو یاد آتے ہیں

جفائے طعنۂ اغیار یاد رہتی ہے
غمِ فراق کے صدمے تو بھول جاتے ہیں

الٰہی خیر ہو یہ آج دیکھتا کیا ہوں
وہ دیکھ دیکھ کے کیوں مجھ کو مسکراتے ہیں

دلِ حزیں کو میں اپنے فریب دے لوں گا
کوئی یہ جھوٹ ہی کہہ دے مجھے وہ آتے ہیں

ہم اپنے بھولنے والوں کو چاہتے ہیں حفیظؔ
وہ اپنے چاہنے والوں کو بھول جاتے ہیں

(۲)

تغافل کا کروں اُن سے گلہ کیا
وہ کیا جانیں جفا کیا ہے وفا کیا!

محبت میں تمیزِ دشمن و دوست!
یہاں ناآشنا کیا، آشنا کیا

زمانے بھر سے میں کھویا گیا ہوں
تمہیں پاکر مجھے آخر ملا کیا

پھریں مجھ سے زمانے کی نگاہیں
پھری مجھ سے نگاہِ آشنا کیا

وفا کے مدعی! افسوس افسوس!
تجھے بھی بھول جانا آگیا کیا

نہ مانی ہے نہ مانیں گے تری بات
حفیظؔ اُن سے تقاضائے وفا کیا

حفیظ ہوشیارپوری

بوڑھا سازندہ

مدرس کہنے لگا اُن دنوں میں بھی بھجن منڈلی میں تھا۔ اور کرسمس کے اس ہفتے بھی حسبِ معمول ہمیں تعلقدار کے مکان پر جمع ہو کر بڑے کمرے میں سردار کے عزیزوں اور مہمانوں کی موجودگی میں گانے کی محفل لگانی تھی۔ مہمانوں میں نائب پادری لارڈ اور لیڈی ہیکس بائی اور جانے اور کون کون تھا۔ محفل برخاست ہونے پر جاتی دفعہ ہمیشہ نوکروں کے بڑے کمرے میں ہماری خوب دعوت ہوا کرتی۔ جس میں نہایت مکلف کھانے ملتے۔ انڈریو بھی جانتا تھا کہ وہاں اس اس طرح ہوا کرتا ہے۔ چنانچہ جب ہم جانے کی تیاریاں کر رہے تھے تو وہ ہمارے پاس آن کھڑا ہوا اور کہنے لگا خدایا! اس دعوت میں شریک ہونے کو میرا بہت ہی جی چاہتا ہے جس میں کہیں گائے کا اور کہیں بیل مرغ کا گوشت کہیں کشمکش والی پڈنگ اور کہیں جو کی شراب ملتی ہے۔ میاں! تم لوگوں کی تو چاندی ہے۔ تم تو اس دعوت میں شریک ہونے کے لئے ابھی ابھی خوش خوش جا بھی رہے ہو۔ بھئی تمہیں بتاؤ کہ ایک آدمی کی کمی یا زیادتی سردار محسوس کرے گا؟ گانے والے لڑکوں کے ساتھ تو میں جا نہیں سکتا۔ بڑا ہوں۔ اور گانے والی لڑکیوں میں بھی چھپ کر نہیں نکل سکتا۔ داڑھی کا کیا کروں۔ اے پڑوسیو! تم ہی مجھے ایک سارنگی ادھار دے ڈالو تاکہ میں سازندہ بن کر ہی اندر کھسک جاؤں .... دے دو گے"!!؟

خیر ہمارے دل نے گوارا نہ کیا کہ خواہ مخواہ اس کی راہ میں روڑا اٹکائیں۔ ہمارا کیا تھا ہم نے اُسے ایک پرانی سارنگی دے دی حالانکہ ہم جانتے تھے کہ اُسے اس فن سے کبھی دور کا واسطہ بھی نہیں پڑا۔ وہ سارنگی سے مسلح ہو کر ہم سب کے ساتھ عین وقت پر جا پہنچا۔ پھر سارنگی بغل میں دبائی اور نہایت بے باکی سے اندر آ داخل ہوا بس سمجھ لیجیے کہ موسیقی کی کتابیں کھولنے اور موم بتیوں کی روشنی سُروں پر ڈالنے کے لئے انہیں مناسب جگہ اِدھر اُدھر رکھنے میں تو اس نے بے ساختہ پن ظاہر کرنے کی کوشش صرف کر ڈالی۔

پہلے ہم نے ایک نظم گائی پھر دوسری پھر تیسری، لیکن اس کے بعد؟ بس اس کے بعد کچھ نہ پوچھئے سردار کی ماں ـــ ہاں وہی ایک اونچی لمبی تند خو بڑھیا جسے گرجے کی موسیقی سے بہت دلچسپی تھی ناگہاں آ پہنچی اور آ کر انڈریو سے کہنے لگی "ارے مردوے! تو دوسروں کے ساتھ سارنگی نہیں بجا رہا! یہ کیا؟"

اس وقت انڈریو پر الغاروں پانی پڑ گیا۔ اس کی قابلِ رحم حالت دیکھی نہ جاتی تھی اور اس کے چہرے پر ایک رنگ آتا ایک رنگ جاتا دیکھ کر وہ تو کیا خود ہم بھی مارے شرم کے مٹی ہو رہے تھے۔ اب ہم دھڑکتے ہوئے دلوں کے ساتھ بے چینی سے انتظار کر رہے تھے کہ آخر یہ حال سے بے حال آدمی بے حال سے حال کب ہوگا۔

وہ ایک بچے کی طرح نہایت مسکینی سے جھک کر آداب بجا لاتے ہوئے کہنے لگا "بڑی بی کیا کہوں! میری بدقسمتی!! اسٹرک پر سے آ رہا تھا کہ گر گیا اور میری سارنگی کا گز ٹوٹ گیا"۔

"ا...... ر...... ے! بڑے افسوس کی بات ہے!! لیکن اس کی مرمت بھی تو ہو سکتی ہے!"

"نہیں بڑی بی! اب مرمت کیا ہو گی وہ تو چُور چُور ہی ہو چکا ہے"۔

"اچھا دیکھوں گی شاید تمہارے لئے کچھ مل جائے"

ہم نے دل میں کہا "چلو معاملہ ختم ہوا سستے چھوٹ گئے اور اب ہم "اے چاند! اے چاند" والی نظم گانے لگے۔ جونہی یہ نظم ختم ہوئی وہ پھر سر پر آ دھمکی اور انڈریو سے کہنے لگی:۔ "میں نے ایک آدمی بالاخانے پر بھیجا تھا وہاں کچھ پرانی سارنگیاں پڑی تھیں تمہارے لئے وہاں سے گز مل گیا ہے" یہ کہہ کر اس نے گز قسمت کے مارے غریب انڈریو کے ہاتھ میں دے دیا۔ اور کہنے لگی "لو اب ہمارا ساتھ پورا ہو جائے گا"۔

انڈریو سامنے کتاب رکھے سازندوں کے حلقے میں کھڑا تھا۔

گز دیکھ کر بے چارے کا چہرہ اس طرح متغیر ہو گیا جیسے گلا سڑا سیب ہو۔ کیونکہ بستی میں اگر کوئی فرد ایسا تھا جس سے سب خوف کھاتے ہوں تو وہ طوطے کی ناک والی یہ بڑھیا تھی۔
تاہم انڈریو ایک دوسرے آدمی کی پشت کی آڑ لے کر لوگوں کو دھوکا دینے کی کوشش کرنے لگا کہ وہ بس سارنگی بجانے کا آغاز کرنے ہی کو ہے۔ آخر اس نے گز سے سارنگی پر آرہ کشی شروع کر دی، پر اس طرح کہ گز تاروں کو چھوتے تک نہیں۔ اس وقت ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ وہ دل و جان سے نغموں کی تخلیق کرنے کے لئے جد و جہد کر رہا ہے۔ شاید اسی طرح کچھ بیچ بچاؤ ہو جاتا۔ اگر سردار کے آدمیوں میں سے ایک ـــ وہی نائب پادری ـــ دیکھ نہ لیتا کہ اس نے سارنگی کچھ عجیب ٹیڑھی میڑھی اور آڑی ترچھی کر کے پکڑ رکھی ہے۔ یہ دیکھ کر باقی سازندے بھی اس کے گرد امنڈ آئے۔ یہ دیکھنے کے لئے کہ شاید سارنگی بجانے کا یہ کوئی نیا طریقہ ہو ـــ
یہاں آکر تمام بھید کھل گیا اور اس عورت نے انڈریو کو مکار اور دغا باز کہہ کر باہر نکال دیا۔ جشن کی آئندہ کارروائی کی فضا ایک حد تک بگڑ سی گئی اور سردار نے گرج کر کہا "نکال دو اسے! کہہ دو اسے کہ دو ہفتے کے اندر اندر اپنی جھونپڑی سے چلتا بنے۔ بہرکیف جب ہم نوکروں کے کمرے میں پہنچے تو کیا دیکھتے ہیں کہ انڈریو بھی وہاں ایک جگہ چپ چاپ بیٹھا ہے۔ اُسے سردار کے حکم سے کمرے کے سامنے کے دروازے سے باہر نکال دیا گیا تھا اور سردار کی بیوی کے حکم سے پھر پچھلے دروازے سے اندر داخل کر لیا گیا تھا۔ لیکن اس رات کے بعد انڈریو پھر کبھی ہماری کسی محفل میں سازندہ بن کر نظر نہ آیا۔ اور اب تو بیچارے کو مرے مٹے بھی ایک مدت ہو گئی ہے اسی طرح ہم بھی کبھی مر کھپ چکے ہوں گے۔

طامس ہارڈی

مہدی علی خاں

یادِ ایام

ایک چاندنی رات کا تصور

سکوتِ شام تھا، ہم تم تھے، دریا کا کنارہ تھا
جدا ہونے سے پہلے کس قدر دلکش نظارہ تھا
کسی نے آسماں سے حسن کے موتی بکھیرے تھے
فضا میں قاف کی پریوں کے جلووں کے بسیرے تھے
شباب و حسن کی رنگینیاں تھیں جلوہ زا گویا
فضا کا ذرہ ذرہ اِک سراپا شعر تھا گویا
شرابِ حسن سے مخمور تھا ہر قطرہ دریا کا
ہجومِ کیف سے معمور تھا ہر قطرہ دریا کا
نچھاور ہو رہی تھی چاندنی تیری جوانی پر
جوانی چھا رہی تھی عشق و الفت کی کہانی پر
سفینہ چاندنی کا تھا رواں دریا کے سینے پر
ہمارے عیش کے دن جا رہے تھے اس سفینے پر
یہ راتیں آہ یہ رنگینیاں سب کھو گئیں مجھ سے
تری الفت میں حاصل تھیں مگر اب کھو گئیں مجھ سے

تابش صدیقی

بتانِ ہند قبضۂ فرنگ میں

رسالہ "انڈیا" لنڈن بابت ماہ اکتوبر ۱۹۲۹ء میں ایک مضمون (The House of Palmer) کے نام سے شائع ہوا ہے جسے برگیڈیر جنرل آر، جے، برٹن "نے "ہندوستانی تاریخ کا ایک رومان" لکھ کر شائع کیا ہے۔ اور رسالہ ادیب پشاور کے سالنامہ بابت ۱۹۳۰ء میں اس کا ترجمہ "خاندانِ پامر" کے نام سے طبع ہوا ہے۔

اس افسانے سے حسبِ ذیل باتیں اخذ ہوتی ہیں۔

(۱)۔ مسٹر پامر مالک ہندوستانی ہوٹل، ریجنٹ اسٹریٹ لندن، ولیم پامر کے خاندان سے ہیں۔

(۲)۔ ولیم پامر نے لکھنؤ کی ایک حسین شہزادی سے شادی کی تھی۔ جو خاندانِ مغلیہ سے متعلق تھی (افسانے سے متعلق جو تصویر شائع ہوئی ہے اس میں اس شہزادی کا نام (Fyfun Nissa) اور دہلی کی شہزادی لکھنؤ کی متوطن (Begum of Delhi.) لکھا ہے اور اس تصویر کو زفانی (Zaffani.) مصور کا شاہکار لکھا ہے۔

(۳)۔ ولیم پامر نے ۱۷۹۹ء میں سرکارِ عالی (حکومتِ نظام) میں فوجی ملازمت کی اور مختلف خدمات انجام دیں۔

(۴)۔ ۱۸۱۰ء میں ولیم پامر نے بنک قایم کیا اور رمبولڈ سے شرکت کر لی۔

(۵)۔ مہاراجہ چندولعل بہادر پامر بنک سے رقم لیا کرتے تھے۔

(۶)۔ پامر کو قیامِ بنک کے لئے اس کی ماں شہزادی سے رقم ملی تھی۔

(۷)۔ میڈوز ٹیلر نے ولیم پامر کی لڑکی سے شادی کی تھی۔

(۸)۔ ولیم پامر کا پوتا اڈورڈ پامر مالک انڈین رسٹارنٹ کا ماموں تھا

(۹)۔ سرکارِ عالی (حکومتِ نظام) پامر بنک کی رقم جو قرضہ لی گئی تھی دیندار رہے۔

گربل صاحب نے اپنی تاریخ دکن کی دوسری جلد میں لکھا ہے کہ

"مسٹر پامر ایک مخلوط النسل شخص تھے ان کے والد جنرل پامر سے ایک ہندوستانی لڑکی بیاہی گئی تھی جس کے بطن سے جارج پامر، ولیم پامر، ہسٹنگس پامر نامی تین لڑکے تھے جارج پامر نے کلکتہ میں بینکنگ شروع کی تھی۔ ولیم پامر اور ہسٹنگس پامر دونوں نے حیدرآباد آکر ایک بنک کھولا، حضورِ نظام نے بھی فوجی ضروریات کے لئے اس بنک سے قرضہ لیا تھا۔ اس کے حصہ داروں میں رمبولڈ نامی ایک مالدار شخص بھی تھا۔ پامر نے اپنے بنک کے توسط اور ایجنٹ کی حیثیت سے ولایتی سامان منگوا کر اور امراء دکن کو دے کر اور ان کی فرمایشیں پوری کر کے اس قدر رسوخ حیدرآباد میں پیدا کر لیا تھا کہ ریذیڈنٹ سے زیادہ شہرت ہو گئی تھی"

(ملاحظہ ہو گربل صاحب کی تاریخ جلد دوم صفحہ ۱۵۰ و ۱۶۱)

اس کے علاوہ گربل صاحب نے یہ بھی لکھا ہے کہ پامر نے ۱۷۹۹ء میں علاقہ فوج میں نوکری کی اور ۱۸۱۰ء میں وظیفے پر علیحدہ ہوئے۔

(ملاحظہ ہو صفحہ ۱۴۴ و ۱۵۰)

ہسٹنگس پامر کے فرزند اڈورڈ پامر مہاراجہ چندولعل بہادر کے زمانے میں بحیثیت ڈاکٹر پانچ سو روپے ماہوار پر ۱۸۴۳ء تا ۱۸۵۹ء ملازم رہے اور یہ ملازمت خانگی تھی مہاراجہ چندولعل اپنی ذات سے ان کی تنخواہ دیا کرتے تھے۔ مگر اڈورڈ پامر فضول خرچی اور عیاشی کی وجہ سے ہمیشہ مفلس رہے اور بے انتہا مقروض ہو کر انتقال کیا ان کے مرنے پر سنڈکہ ہراج کر کے قرض خواہوں میں تقسیم کر دیا گیا۔ ۱۸۶۳ء تا ۱۸۱۲ء میں بعض امرا نے ضروتاً مہاراجہ چندولعل بہادر کی ضمانت پر پامر بنک سے کچھ رقم قرض لی تھی جس کے متعلق عام شہرت ہے۔ ۱۸۴۰ء میں حیدرآباد میں ایک مقدمہ رمبولڈ کے قرضے کا چلتا رہا جس میں حکومتِ نظام کو رمبولڈ کا مقروض ظاہر کیا گیا تھا اور یہ وہی قرضہ تھا جسے حکومت نے پامر بنک سے حاصل کیا تھا۔

اصل واقعہ یہ ہے کہ ۱۸۰۰ء میں پامر صاحب اورنگ آباد میں متعین تھے۔ اور وہاں پر انہوں نے ایک پنجابن سے تعلقات پیدا

کر لئے تھے جس کی ایک لڑکی بھی تھی جو کرنل میڈوز ٹیلر سے منسلک ہوگئی۔ چنانچہ "تارا" جب کیپٹن بہادر کے تفویض ہوگیا تو کرنل میڈوز ٹیلر نلدرگ پر متعین کئے گئے اور وہیں انتقال کیا اور نلدرگ کے قریب[1] دفن ہوئے۔ چنانچہ یہ واقعات نلدرگ اور عثمان آباد میں زبان زد خاص و عام ہیں۔

حیدرآباد میں اب تک پامر صاحب کے واقعات مشہور ہیں کہ انھوں نے مسٹر رمبولڈ سے جو نہایت متمول تھے رقم لے کر بنک کھولا اور رمبولڈ بنک کا دیوالہ نکلنے کر ابن صاحب کے پاس ملازمت کرلی ابن صاحب کی تجارتی کوٹھی ترپ بازار میں تھی جہاں پہلے "عزیز کمپنی" تھی ابن صاحب نے اپنی زندگی میں ایک مسجد بنوانی شروع کی تھی اور جب مسجد کی تعمیر ختم ہوگئی تو مسجد کے پاس ایک مقبرہ کی بنا ڈالی مگر تعمیر شروع ہوتے ہی ابن صاحب کا انتقال ہوگیا۔ ابن صاحب کے ورثا نے پامر کو اپنی تجارتی کوٹھی کے منیجر کی حیثیت سے رہنے دیا اور مقبرہ کی تعمیر کی نگرانی بھی پامر صاحب ہی سے متعلق کردی، پامر صاحب نے اپنی نگرانی میں مقبرے کی تعمیر شروع کرائی اور ان کی نگرانی ہی میں مقبرہ بنا۔ چونکہ پامر صاحب مختار کل کی حیثیت سے نہایت فراخ دلی کے ساتھ مقبرہ کی تعمیر کراتے رہے اور تعمیر کا کام کرنے والی مزدورنیوں سے بھی دلچسپی پیدا کرلی تھی اس لئے لوگوں نے اس مقبرے کو پامر کے نام سے مشہور کردیا اور اب تک وہ مقبرہ "مقبرہ پامر" کہلاتا ہے حالانکہ اس میں ابن صاحب کے خاندان کے لوگوں کی قبریں ہیں۔

رسالہ "انڈیا" کے افسانے میں اس شہزادی کا نام جو پامر سے منسوب تھی (Fyfun Nissa Regum) لکھا گیا ہے۔ نام کی لطافت و بیگانگی خود اس امر کی دلیل ہے کہ کسی انگریز نے کوئی فرضی نام تراشنے کی کوشش کی ہے اب چاہے اس نام کے تراشندہ مسٹر زفانی مصور ہوں یا برگیڈیر جنرل، آر جے، برٹن ہوں۔

ویراسوامی نامی ایک مدراسی یا بنگلوری نے لندن پہنچ کر ویمبلی کی نمائش میں ایک ہندوستانی ہوٹل قایم اور پھر ریجنٹ اسٹریٹ نمبر ۱۲ مارس روڈ پر "ویراسوامی انڈین رسٹارنٹ" کے نام سے ہوٹل قایم کیا اور اپنے آپ کو اڈورڈ پامر کا بھانجا اور اڈورڈ پامر کے دادا سے کسی شہزادی کا بیاہا جانا مشہور کردیا۔ لطف یہ ہے کہ آپ کا اسم گرامی "ویراسوامی" ہے اور پھر اپنے آپ کو انگلو انڈین اور وہ بھی اس طرح کا کہ مسلمان شہزادی اور انگریز پامر کے ازدواج کا نتیجہ فرماتے ہیں مگر یہ سمجھ میں نہیں آیا کہ سوامی کیسے بن گئے یہ نام مدراسی ہندوؤں کے لئے مخصوص ہے۔ پامر کے خاندان والوں کا نام انگریزوں کا سا ہونا چاہئے تھا یا مسلمانوں کا سا۔ برگیڈیر جنرل نے انہیں ویراسوامی کے سنائے ہوئے افسانے کو نہایت ہی تاریخی رومان سمجھ کر تحریر فرمادیا اور شاید انہیں کی بنائی ہوئی تصویر بھی شائع کردی جسے تاریخ اور صداقت سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

اکثر انگریزوں نے بڑی تحقیق کے ساتھ ان یورپینوں کے حالات لکھے ہیں جن سے ہندوستانی مسلمان یا ہندو عورتیں بیاہی گئیں یا متعلق تھیں۔ رسالہ مسلم ریویو جلد نمبر ۴ و نمبر ۱ بابت ۱۹۲۹ء میں ایک مضمون ایچ، ڈبلیو، بی، مورینو (Moreno) بی اے پی ایچ ڈی کا طبع ہوا ہے جس میں اسی قسم کی تیرہ عورتوں کا تذکرہ ہے

(۱) لیڈی ویلز جو اپنے شوہر اور بچوں سمیت ۱۸۵۷ء کے غدر میں کانپور کے باغیوں کے ہاتھ سے قتل ہوئی برہمن خاندان کی لڑکی تھی جس کے مزید حالات معلوم نہ ہوسکے

(۲)۔ سر ولیم جیمس ہیروئنٹ چبر مین ایسٹ انڈیا کمپنی جو محکمہ بحریہ بمبئی سے متعلق تھے اپنی خدمت سے علٰحدہ ہوئے تو ان کی جگہ ان کا لڑکا رچرڈ مقرر ہوا۔ جو سر ولیم کی دوسری بیوی سے پیدا ہوا تھا جو خالص ہندوستانی تھی۔ رچرڈ پہلا نیم ہندوستانی انگریز ہے جس نے اپنے باپ کی وفات کے بعد انگلستان میں اپنی جائداد کی فرزنت حاصل کی

(۳)، مسز فرانسس جانسن جو کلکتہ میں بیگم کے نام سے مشہور تھی۔

(۴)، زیب النسا جو بیگم سمرو کے نام سے مشہور ہوئی۔

(۵)، بہا بیگم (؟) ایک مسلمان عورت تھی جو بعد میں دیوانی ہوگئی اور جس کا انگریز بیٹا نواب ظفریاب خاں کے نام سے مشہور ہوا اسی بیگم نے ۱۷۸۱ء میں آگرہ میں مذہب مسیحی بھی اختیار کیا۔

(۶)۔ بہو بیگم جس نے سمرو کے بیٹے سے شادی کی اور اس کا نام جولیا رہی مشہور ہوا۔ اس کے شوہر نے ۱۸۰۲ء میں بمقام دہلی بحالت قید انتقال کیا۔

(۷)، اس عورت کی ایک لڑکی بھی تھی جس کا نام بیگم تھا اس کی شادی نومبر ۱۸۰۶ء میں ایک یوریشین سے ہوئی جس کا نام ڈائس تھا یہ بھی ظفریاب خاں کی طرح اردو کا شاعر تھا اس کا نام جارج الکزنڈر ڈیوڈ ڈائس اور آزاد تخلص تھا۔

(۸)، خیر النسا بیگم جس کی شادی حیدرآباد کے ریذیڈنٹ کرک پیٹرک سے ہوئی۔

(۹)۔ لطف النسا خیر النسا کی رشتہ دار تھی اور سر ہنری رسل سے جو بعد میں حیدرآباد کا ریذیڈنٹ ہوا بیاہی گئی۔

(۱۰)۔ نیشنل پورٹریٹ گیلری لندن میں کرنل ولیم لائٹ (۱۷۸۴ء، ۱۸۳۹ء) کی ایک تصویر ہے اور کیٹلاگ میں بتایا گیا ہے کہ یہ کسی ملایا کی شہزادی

---

[1] نلدرگ درسلنگ گور یعنی عثمان آباد اور رائچور [2] ان کی بسائی ہوئی بستی ٹیلر نگر کے کھنڈر اب تک موجود ہیں اور وہیں ان کی قبر بھی ہے ۱۲

کا بیٹا ہے۔

(۱۱) مس گرانٹ کے نام سے ایک خاتون نے شہرت حاصل کی ہے انڈیا گزٹ مورخہ ۲۰ دسمبر ۱۸۳۰ء نے اس کے حسن جمال کی تعریف کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ہندوستانی خاندان سے ہے اور انگریزی سوسائٹی میں اس کی بڑی عزت ہے۔

(۱۲) کرنل ولیم لائنس کارڈنر (۱۷۷۰-۱۸۳۵) کی شادی نواب ملکن النسا بیگم (۱) سے ہوئی تھی جو کیمبے کے ایک رئیس کی لڑکی تھی شادی کے بعد میاں بیوی چالیس سال تک خاص گاؤں ضلع ایٹہ میں رہے ان سے دو لڑکے پیدا ہوئے تھے جن میں سے ایک بیٹے جیمس نے اپنے باپ کی طرح مرزا سلیمان شکوہ کی لڑکی سے شادی کی۔

(۱۳) خانم ظہور النسا۔ یہ اکبر شاہ کی پروردہ تھی اور میجر حیدر جنگ ہیر (۱۷۸۷-۱۸۴۰) سے بیاہی گئی۔

(۱۴) کرنل رابرٹ وار برٹن (۱۸۴۲-۱۸۹۹) نے نومبر ۱۸۶۲ء میں امیر دولت خاں کی بھتیجی سے شادی کی۔

(۱) ملاحظہ ہو مسلم ریویو جلد ۴ نمبر ۱ بابت ۱۹۲۹ء

محترمی مولوی محمد سردار علی صاحب مدیر رسالہ تجلی نے "یورپین شعرائے اردو" کا ایک تذکرہ نہایت کاوش سے لکھا ہے جس میں الگزینڈر ہیڈرلی (Alaxander Hederley) کا بھی تذکرہ کیا ہے جو آزاد تخلص کرتے تھے۔ ان کے باپ انیسویں صدی کے اوائل میں یہاں آئے اور کسی مسلمان عورت سے شادی کر لی اور ہندوستانی طریقے پر زندگی بسر کرنے لگے الگزینڈر کی ماں نے ان کی تربیت بالکل مسلمان بچوں کی طرح کی تھی۔ الگزینڈر نے طب میں خاصی دستگاہ پیدا کر لی تھی اور مطب بھی کرنے لگے تھے مگر نہایت ذہین تھے باپ کے مرنے کے بعد سارا اندوختہ ختم کرکے ریاست الور گئے اور توپخانے کے کپتان ہو گئے۔ مگر ملازم ہونے کے ایک ہی سال کے اندر ۲۷ جولائی ۱۸۶۱ء (۱۲۷۷ھ) کو ۳۲ برس کے سن میں انتقال کیا غالباً ۱۸۲۹ء میں تولد ہوئے۔

الگزینڈر ہیڈرلی کے بڑے بھائی تھامس ہیڈرلی بھرت پور میں ڈپٹی تھے جنہوں نے الگزینڈر کا دیوان طبع کرایا ہے ان کے علاوہ الوسیس رین ہارٹ (Aloysks Rernharrat) صاحب تخلص کا تذکرہ بھی کیا ہے کہ یہ ظفر یاب خاں نام مظفر الدولہ خطاب سے سرفراز تھے اور سردھنہ کی بیگم سمرو ملقب بہ زینت النساء کے فرزند تھے مسلمانوں کی طرح رہتے تھے۔ دہلی میں ان کے مکان پر مشاعرہ ہوا کرتا تھا۔

خیراتی خاں دلسوز کے شاگرد تھے ۱۸۲۷ء میں عالم شباب میں انتقال کیا۔

بیگم سمرو کے متعلق صاحب تذکرہ یورپین شعرائے اردو نے لکھا ہے کہ

"بیگم سمرو عرف زینت النساء ایک عرب مسلمان کی بیٹی تھی
اس نے عیسائی مذہب اختیار کر لیا تھا اور جنرل سومبر سے
شادی کر لی تھی اپنے شوہر کی وفات کے بعد وہ سردھنہ کی
حکمران ہوئی اور ۱۸۳۶ء میں وفات پائی"۔

بعض تذکروں میں ایک شاعرہ جمیعت کا حال لکھا ہے کہ اس خاتون کی ماں ہندوستانی تھی اور باپ انگریز تھا اور اس خاتون نے بیمار جسٹن سے شادی کی تھی آگرہ میں رہتی تھی ۱۸۸۴ء کے پس و پیش میں زندہ تھی (دیکھو تذکرہ ماہ درخشاں صـ۱۳۱، تذکرۃ النسا نادری صـ۴۸، مشاہیر نسواں صـ۱۹۵، بہارستان ناز صـ۳۶)

دلی میں محمد یوسف کشمیری نامی کوئی سادہ کار تھا جس کی بیٹی مسٹر بلاک نامی کسی انگریز کے گھر بیٹھ گئی تھی اس کے بطن سے ایک لڑکی تھی جو دلی کے یوسف والیوں کے ڈیرے کی جان تھی۔ بادشاہ بیگم نام تھا اور خفی تخلص کرتی تھی مگر نس مشہور تھی آخر میں ڈیرہ داری چھوڑ کر کسی انگریز کے گھر پڑ گئی تھی، اچھی شاعرہ اور خطاط تھی، ۱۸۴۷ء میں زندہ تھی،

(تذکرۃ النسا نادری صـ۹۰، مشاہیر نسواں صـ۲۴۲ و ۲۴۳، بہارستان صـ۴۵)

ان عورتوں کے علاوہ دوسری عورتوں کے حالات ہمیں مل نہ سکے۔ جس طرح کہ شریف گھرانے کی یورپین عورتوں نے ہندوستانیوں سے اعتنا نہیں کی اسی طرح شریف گھرانے کی ہندوستانی عورتوں نے بھی انگریزوں کو ناپسند کیا ہے متذکرہ بالا عورتوں میں سوا ایک آدھ کے کوئی شریف خاتون انہیں نہیں ملی۔

بعض افسانہ نگار انگریزوں نے یہ مشہور کر دیا ہے کہ شاہان مغلیہ، شاہان اودھ اور تاجداران دکن کی لڑکیاں بعض انگریزوں سے بیاہی گئیں مگر یہ غلط ہے بفضلہ تعالیٰ اب تک کوئی لڑکی خاندان مغلیہ ہی کی کسی یورپین سے بیاہی گئی نہ شاہان اودھ کی اور تاجداران دکن کی۔

مسلم ریویو نے مسٹر جیمس سے مرزا سلیمان شکوہ کی صاحبزادی کا تذکرہ کیا ہے مگر جہاں تک ہماری معلومات کا تعلق ہے یہ قصہ بھی فرضی نظر آتا ہے۔ برادران دہلی اس پر تحقیقی روشنی ڈالیں تو بہتر ہے۔

سید تمکین کاظمی

دو آتشہ

(۱)

وہ اگر بے نقاب ہو جائے ‌ ‌ ‌ ہر نظر آفتاب ہو جائے

دیکھ اس طرح مست آنکھوں سے ‌ ‌ ‌ پھول جامِ شراب ہو جائے

اک نگاہِ کرم مری جانب ‌ ‌ ‌ ذرہ پھر آفتاب ہو جائے

تم اگر وقتِ نزع آ جاؤ ‌ ‌ ‌ زندگی کامیاب ہو جائے

کم سے کم اتنی میکشی تو ہو! ‌ ‌ ‌ روح غرقِ شراب ہو جائے

منتشر کر نظامِ دنیا کا ‌ ‌ ‌ ہر سکوں اضطراب ہو جائے

ہے بڑا خوش نصیب جو ماہر

بندۂ بوتراب ہو جائے

(۲)

تیغ پھر بے نیام ہو جائے ‌ ‌ ‌ ہاں ذرا قتلِ عام ہو جائے

دل کو کوہِ الم سے ٹکرا دوں ‌ ‌ ‌ آج قصہ تمام ہو جائے

تجھ پہ زاہد خدا کرے کہ شراب ‌ ‌ ‌ خلد میں بھی حرام ہو جائے

تم کسی دن جھلک دکھا جاؤ ‌ ‌ ‌ دور ہی سے سلام ہو جائے

ٹوٹ جائے حدِ خصوصیت ‌ ‌ ‌ کاش دیدار عام ہو جائے

مجھ پہ اس طرح میکشی ہو فرض ‌ ‌ ‌ یعنی توبہ حرام ہو جائے

بعد مدت کے آج تو ماہر

شغلِ شربِ مدام ہو جائے

ماہر القادری

دنیائے ادب

اردو

ترکی وزارتِ تعلیم کی دہ سالہ خدمات

ترکوں نے جنگِ عظیم کے بعد استقلال و آزادیٔ وطن کے لئے جو سر فروشانہ متحدہ کوششیں کیں، ان کا ایک اثر یہ بھی تھا کہ ۲ اسالہ طلبہ تک مدارس و مکاتب سے نکل کر میدانِ جنگ میں آ گئے، اور سرفروشی کرکے وطن کی عزت و ناموس بچائی۔

وزارتِ تعلیم کی خدمات | استقلالِ وطن کے بعد یہ طلبہ پھر مدارس و مکاتب میں لوٹ آئے، اس وقت تک یہ مدرسے پہلے سے زیادہ زبوں حالات میں پہنچ چکے تھے۔ اور ملک میں تعلیمی ترقی کا سلسلہ مسدود ہو چکا تھا۔ اس لئے جب نوجوان ترک، استقلالِ وطن کے بعد اصلاحِ وطن کی جانب متوجہ ہوئے تو تعلیمی سلسلہ میں ان کی پہلی نظر انہی مدارس و مکاتب پر پڑی، اور انہوں نے حکومت میں ایک شعبۂ وزارتِ تعلیم قایم کرکے تمام تعلیمی مسائل اس کے سپرد کر دیئے، وزارتِ تعلیم نے اپنا تعلیمی پروگرام مرتب کرکے اپنی دہ سالہ کوششوں سے ان مدارس و مکاتب کو ان کے اعلیٰ مدارج تک پہنچا دیا، اور طلبہ کی ایک کثیر تعداد صحیح و مفید تعلیمات سے بہرہ اندوز ہو کر ان مدارس سے نکلی

اس تعلیمی پروگرام میں سب سے پہلی چیز دار المعلمین (ٹریننگ کالج) کی بنا و تاسیس تھی، چنانچہ ۲۵ دار المعلمین قایم کئے گئے جن سے اساتذہ کی ایک کثیر تعداد فارغ التحصیل ہو کر نکلی اور آج کل انہی دار المعلمین کے فارغ التحصیل میں سے پندرہ ہزار اساتذہ ابتدائی جماعتوں کو تعلیم دیتے ہیں، جن میں اس وقت پچاس ہزار طلبہ زیرِ تعلیم ہیں، اگر اس تعداد کو ترکوں کی مردم شماری کے اعداد و شمار سے تطبیق دی جائے تو معلوم ہوگا کہ گویا ترکی میں جبری ابتدائی تعلیم کا قانون رائج ہو چکا ہے۔

ترکوں نے جبری تعلیم کا ایک قانون بھی نافذ کیا جس سے ترکوں کے خواندہ افراد کے اعداد و شمار میں نمایاں ترقی ہوئی جس زمانہ میں ترکی میں نئے لاطینی حروف رائج کئے گئے، ان دنوں وہاں ہزاروں مدارس ہر ہر شہر اور قریہ میں کھولے گئے۔ اور حکم نافذ ہوا کہ ترکی کا ہر متنفس اپنے روزانہ کے معمولات سے فارغ ہو کر ان مدارس میں حاضر ہو اور ان حروف میں لکھنا پڑھنا سیکھے، ہر شہر کے باشندوں کی حاضری کا رجسٹر مرتب کیا گیا۔ اور ان رجسٹروں میں شہر کے ہر باشندے کی حاضری لازمی قرار پائی، اور ان حروف میں نوشت و خواند کی سند کا حاصل کر لینا بھی لازمی قرار پایا، چنانچہ تمام مرد، عورت بوڑھے، جوان، امیر اور فقیر ان مدارس میں حاضر ہونے لگے، اور اس وقت تک آٹھ لاکھ نفوس ان لاطینی حروف میں لکھنے پڑھنے کی سند حاصل کر چکے ہیں، اس جبری تعلیم سے ترکوں کی خواندہ جماعت میں غیر معمولی اضافہ ہو گیا۔

اسی طرح اس وقت ترکی کے ثانوی مدارس میں پچاس ہزار طلبہ زیرِ تعلیم ہیں، ان مدارس میں مختلف علوم کے علاوہ زراعت، صنعت اور تجارت وغیرہ کی تعلیم بھی دی جاتی ہے پھر "دار الفنون" کے نام سے مدرسے جداگانہ ہیں، جن میں ثانوی مدارس سے فارغ ہو کر طلبہ داخل ہوتے ہیں، دار الفنون میں ریاضی، طبیعیات، فلسفہ، قانون، و اقتصاد وغیرہ کی تعلیم دی جاتی ہے، دار الفنون کے پروفیسروں کی تعداد ۲۰۰ ہے، دار الفنون میں مختلف مضامین کے لئے جداگانہ مدارسِ عالیہ ہیں جن میں مختلف علوم و فنون تجارت، صنعت، زراعت، جنگلات، کمپونڈری، دندان سازی، بیطاری، انجنیری اور جہاز رانی وغیرہ کی تعلیم دی جاتی ہے۔ اسی طرح فوجی تعلیم کے لئے مدرسۂ حربیہ ہے لیکن اس کا تعلق وزارتِ حربیہ سے رکھا گیا ہے، وزارتِ حربیہ نے بھی ان مدارس پر اپنی پوری توجہ صرف کی ہے اور اعلیٰ تعلیم کا اہتمام کیا ہے۔

ترک لڑکیوں کو بجز مدارسِ حربیہ کے تمام مدارس میں اپنا داخلہ

کرانے کا حق حاصل ہے، چنانچہ وہ بھی مردوں کے دوش بدوش پڑھتی ہیں، اور مدارسِ ثانوی سے نکل کر دار الفنون کے مختلف شعبوں کے مدارسِ عالیہ میں داخل ہوتی ہیں، اور بالعموم ڈاکٹری، کمپونڈری اور دنداں سازی وغیرہ کے مدارس سے فارغ ہو کر نکلتی ہیں، نیز نسوانی ضروریات کی خاص تعلیم کے لئے علیٰحدہ مدرسے کھولے گئے ہیں یہ گویا اسی طرح عورتوں کے لئے مخصوص ہیں جیسے مدارس حربیہ مردوں کے لئے خاص ہیں عورتوں کے ان مدارس میں سب سے اعلیٰ پیمانہ پر انگورہ کا مدرسہ "مدرسۂ عصمت پاشا" ہے، ان مدارس میں نسوانی ضروریات کی تعلیم و تدریس کے وہ جملہ ضروری سامان جو زمانۂ حال میں مہیا ہو سکتے ہیں، موجود ہیں اسی طرح عورتوں کے لئے ایک قسم کے جداگانہ مدارس اور بھی ہیں، جن میں انہیں سینے پرونے، کاڑھنے، بچوں کی پرورش اور امورِ خانہ داری کی تعلیم و تربیت دی جاتی ہے۔

وزارتِ تعلیم نے صنعت طباعت و نشر کا اہتمام بھی اپنے ہاتھ میں رکھا ہے، مطابع زیادہ تر قسطنطنیہ میں کھولے گئے ہیں جن سے کتابوں کی بڑی تعداد چھپ کر نکلتی ہے، چنانچہ اعداد و شمار کے لحاظ سے تین ہزار قسم کی کتابیں سالانہ چھپ کر نکلتی ہیں، اور ان کی مجموعی تعداد چار لاکھ ہوتی ہے، اسی طرح اس نے مدارس کے نصابِ تعلیم کی کتابوں کی تالیف و ترجمہ کا اہتمام بھی اپنے ہاتھ میں رکھا ہے، جن طریقوں پر نصاب کی یہ کتابیں تیار کی گئی ہیں، اور جس نوع کے ان میں مضامین ہیں ان کا تذکرہ معارف کے ان صفحات میں کسی گذشتہ موقع پر آچکا ہے۔

وزارتِ تعلیم نے ملک میں علوم و فنون اور صنعت و حرفت کے پھیلانے اور ذوق پیدا کرنے کی بھی پوری کوششیں کی ہیں، چنانچہ اکثر شہروں میں زراعت، صنعت و حرفت اور تجارت کی نمایش گاہیں قایم کی گئی ہیں، اور ان کے نہایت مفید اثرات ملک میں مترتب ہوئے ہیں اسی طرح اشاعت کا ایک مخصوص طریقہ اس نے یہ اختیار کیا ہے کہ چند موٹروں پر انواع و اقسام کی چیزیں لاد کر ملک میں انہیں گشت کرنے کے لئے متعین کر دیا ہے، یہ موٹریں ایک شہر سے دوسرے شہر میں جاتی ہیں، چیزوں کی نمایش کرتی ہیں، اور لوگوں کو شوق دلاتی ہیں، ان اشتہاری موٹروں کا تذکرہ بھی ان صفحات میں کسی موقع پر مفصل آچکا ہے۔

اسی طرح علوم تاریخ و جغرافیہ وغیرہ کی خدمت کے لئے مختلف علمی انجمنیں مختلف مقامات پر قایم ہیں، ان انجمنوں کے ارکان کی مجموعی تعداد جو ان سے دلچسپی لیتے ہیں، اور کام کرتے ہیں، ہزاروں تک ہے، یہ تمام جمعیتیں اور انجمنیں ایک مرکزی انجمن "انجمن دانش" (اکاڈیمی) کے ماتحت ہیں۔

ملک میں اس قسم کی مختلف علمی، ادبی، تعلیمی اور صنعتی ترقیوں کے باوجود، ترکی سے ہر سال جو طلبہ تحصیلِ علوم کے لئے یورپ و امریکہ کو جاتے ہیں ان کی تعداد ہر سال ایک ہزار سے زیادہ ہوتی ہے۔

"معارف"

برسات اور ساقی

اُٹھ کہ پھر صحنِ چمن باغِ جناں ہے ساقی
دُو رنگ سلسلۂ ابرِ رواں ہے ساقی

کنج میں مرغِ چمن زاد ہے سرگرمِ نوا
باغ میں بادِ صبا عطر فشاں ہے ساقی

آج خاشاک کے لب پر بھی ہیں شیریں نغمے
آج ذرات کے منہ میں بھی زباں ہے ساقی

شاخساروں میں مرغانِ چمن گرمِ خروش
آسمانوں پہ گھٹا نعرہ زناں ہے ساقی

اس ترنم میں ازل ہے نہ ابد لے ہمراز
اس تلاطم میں زماں ہے نہ مکاں ہے ساقی

اس برستے ہوئے موسم کی ہر اک ساعتِ کیف
شبِ آدینۂ ماہِ رمضاں ہے ساقی

خار بدمست ہیں، گل وجد میں کلیاں سرشار
آج گلشن میں قیامت کا سماں ہے ساقی

بزم پر وادیِ ایمن کا گماں ہوتا ہے
آج وہ نور سرِ رطلِ گراں ہے ساقی

جام دے جام، کہ ہر قطرۂ صہبائے کہن
مصلحِ نسخۂ اجزائے جہاں ہے ساقی

کیفِ صہبائے اُمنگوں کو جگا دے تو بھی
فیضِ باراں سے ہر اک ذرہ جواں ہے ساقی

چہرۂ خاک کی رنگینی و شوخی کی طرف
عالمِ پاک پہ حسرت نگراں ہے ساقی

آج جی بھر کے پلا باغ میں کھلی ہوئی آگ
کوہساروں پہ گھٹاؤں کا دھواں ہے ساقی

نشہ جس طرح مچلتا ہے رگِ صہبا میں
سینۂ ابر میں یوں برقِ تپاں ہے ساقی

شیخ کو کون یہ سمجھائے کہ گلرنگ شراب
مایۂ تربیتِ روحِ رواں ہے ساقی

ان کی خلعت نہیں حورانِ بہشتی کے لئے
یہ تو زہاد کی شکلوں سے عیاں ہے ساقی

ہاں پلا آتشِ سیال کہ جس کی ہر بوند
شمعِ محرابِ جہانِ گذراں ہے ساقی

پائے جاناں پہ کروں کیوں نہ بیاپے سجدے | شورِ قلقل مجھے گلبانگِ اذاں ہے ساقی
غمِ ایام پہ دم بھر کے لئے غور کریں | اتنی فرصت ترے مستوں کو کہاں ہے ساقی
بے خطر ہو کے پلا مے کہ حقیقت میں تو غنا | بزدلوں کا فقط اک وہم و گماں ہے ساقی
کھول نغموں سے در رمز و اشارا کہ آج | سرِ خوباں بحدیثِ دگراں ہے ساقی
روک رندوں کو نہ نادر کہ یہ دور رہا | موسمِ بندگیِ لالہ رخاں ہے ساقی
نرمی و لطف سے لے کام کہ دل تھام کے ان | زندگی کارگہِ شیشہ گراں ہے ساقی

کیوں سنوں زمزمۂ مدعیانِ عرفاں | بادہ خود کاشفِ اسرارِ نہاں ہے ساقی
ان جھلکتی ہوئی شاخوں کے خنک سائے میں | مے کی اک بوند متاعِ دو جہاں ہے ساقی
آ کہ یہ وقت ہر اک شمع سرِ جادۂ باد | اُٹھ کہ یہ عمرِ رواں آبِ رواں ہے ساقی
تجھ سے ممکن ہو تو اس درد کا درماں کر دے | زندگی کو مرضِ سود و زیاں ہے ساقی

جوش کی بحثِ صدارت میں پس و پیش نہ کر
جوش تو قبلۂ رندانِ جہاں ہے ساقی

"زمانہ"

فارسی

ماں اور بچہ

اٹھو! میرے لال۔ تمہاری ماں تم پر نثار! اٹھو۔ تم اب بہت سو چکے! اب نیند تم پر حرام ہے! اٹھو کہ تمہارا باپ آزادی کی جنگ میں مارا گیا اور اپنی جگہ تمہیں سونپ گیا۔ اس لئے میرے لال اُٹھو! میں تم پر قربان! تم میرے کلیجے کے ٹکڑے ہو۔ تم اپنے مرحوم باپ کی نشانی ہو!

اٹھو کہ تمہارے باپ کی تلوار تمہاری ننھی سی کمر میں باندھوں — اور تمہیں — اپنے کلیجے کی ٹھنڈک کو — لڑائی کے میدان میں بھیجوں۔ اٹھو! میرے بہادر سپاہی دشمن دروازے پر آ پہنچا۔ اُٹھو! اور اپنے باپ کی جگہ لو۔ دشمن سے انتقام لو۔ میرے پیارے اٹھو۔ میں تم پر قربان! تم میرے کلیجے کے ٹکڑے ہو! اپنے مرحوم باپ کی نشانی ہو!

میری دونوں آنکھوں کے نور! اُٹھو۔ تمہارے باپ کے بعد تمہاری دکھیاری ماں بے کس اور بے بس ہے۔ اُس کا کوئی سہارا نہیں۔

میرے لال! سوائے تمہارے اُس کا مددگار اور نگہبان کوئی نہیں دشمن دروازے تک آ پہنچا۔ اٹھو اور اپنی ماں کی عزت کی حفاظت کرو میرے چھوٹے سپہ سالار! اٹھو! میں تم پر قربان! تم میرے کلیجے کے ٹکڑے ہو! تم اپنے مرحوم باپ کی نشانی ہو!

اٹھو! اے میرے دل کے چمکتے ہوئے نور! اٹھو! اور اپنی آنکھیں کھولو تاکہ میں تمہاری آنکھوں میں غیرت اور شجاعت کی وہ چمک دیکھوں جو تمہارے باپ کی آنکھوں میں تھی — ہاں! تمہاری آنکھیں تمہارے باپ سے کتنی ملتی جلتی ہیں۔ اٹھو! میں تم پر قربان۔ تم میرے کلیجے کے ٹکڑے ہو۔ تم اپنے مرحوم باپ کی نشانی ہو!

میری جان! کیا تم فوجی باجوں اور مظلوم بھائیوں کی آوازیں نہیں سُنتے — تمہارے ساتھی تمہارا انتظار کر رہے ہیں — تمہیں مدد کے لئے بلا رہے ہیں۔ اُٹھو! اور جلدی سے میدانِ جنگ کی طرف دوڑو یا کامیابی اور فتح مندی کے نعرے لگاتے ہوئے واپس آؤ یا تم بھی اپنے باپ کی طرح وطن کی آزادی کے لئے اپنی جان دے دو — اٹھو پیارے! میرا دودھ تم پر حلال ہو! میں تم پر قربان! تم میرے کلیجے کے ٹکڑے ہو! تم اپنے مرحوم باپ کی نشانی ہو!

سید وقار عظیم

مدراسی

زندگی کا مرثیہ

اے میری شمعِ حیات!
موت کے زہر آلود ہونٹوں نے تجھے اپنی ایک پھونک سے بجھا دیا۔

اے تیرے گُل ہوتے ہی محبت کی روشن چنگاری بھی ٹھنڈی پڑ گئی۔
آہ! اب میری زندگی بھی تیرے بغیر تاریک ہو جائے گی۔

اے میرے نہالِ حیات!
موت کے ستم آفریں پاؤں نے تجھے جڑوں تک روند دیا۔
تو اب اپنی عظمتِ رفتہ کو حاصل نہ کر سکے گا۔
آہ! اب پھول بھی بغیر پودے کے مرجھا جائے گا۔

اے میری روحِ حیات!
موت کی دو دھاری شمشیر نے ہمیں ٹوٹے ہوئے الفاظ کی طرح
جدا کر دیا۔ ہمیں جو درحقیقت ایک ہی تھے جدائی کا سبق دیا۔
آہ! اب جسم بھی بغیر روح کے فنا ہو جائے گا۔

شاعر اور موت

ٹھہر جا اے موت! میرے جامِ حیات کو ابھی مت چھلکا۔
میری شیریں زندگی ابھی اپنی بہار کا دلکش سماں دیکھنے میں
مصروف ہے۔ میری جوانی ایک نوشگفتہ پھول کی طرح امنگوں سے
بھری ہے۔
اور میرے سرسبز شجرِ حیات پر خوش گلو پرندہ بقا کا گیت گا رہا ہے
ٹھہر جا اے موت! ابھی مجھے اپنا پیغام مت سنا۔
میری تمام جوان امیدیں خاک میں مل جائیں گی۔
مجھے چند روز رنگ رلیاں منا لینے دے۔
اور گیت گا لینے دے

ہاں، ابھی مجھے چند آنسو بہانے ہیں۔
ٹھہر جا اے موت!
جب تک کہ میں محبت اُس کے صدموں اور زمین و آسمان
سے منہ نہ پھیر لوں
اور میری تمام دنیاوی خواہشات بر نہ آئیں۔
اے موت! مجھے ابھی اپنا شکار مت بنا
میرے جامِ حیات کو ابھی مت چھلکا۔

خواجہ حسن عباس

انگریزی

کیا تو جا رہی ہے؟

ابھی آئی ہے، ابھی جا رہی ہے؟
میں نہ مانوں گا۔ تیری جدائی مجھے مار ڈالے گی!
میں تیرے بغیر جی نہیں سکتا!
کیا تو جا رہی ہے؟
خدا کے لئے کہہ دے، نہیں!
کیا تو اُسے چھوڑے جاتی ہے جس نے تیرے لئے لمبی
راتیں آنکھوں میں کاٹی ہیں؟
کیا تو اُسے چھوڑے جاتی ہے جس نے تیری یاد میں خون کے
آنسو روئے ہیں؟

کیا تو اُسے چھوڑے جاتی ہے جس نے اپنا دل تیرے قدموں
پر رکھ دیا ہے؟
کیا تو جا رہی ہے؟
خدا کے لئے کہہ دے، نہیں!
کیا تیرے سینے میں دل نہیں، پتھر ہے!
کیا تیرا دل ترس کھانا نہیں جانتا!
کیا تیری آنکھوں میں مروت نہیں!
کیا تو ابھی تو جا رہی ہے!
ہاں ہاں، تو جا رہی ہے — خدا تجھ سے سمجھے۔

میرا دل

میرا دل اُس بھوکی چڑیا کی طرح بے قرار ہے جو دانہ ڈھونڈتی
ہے اور نہیں پاتی۔

میرا دل اس پرند کی طرح ہے جو بھوکا لوٹتا ہے اور اپنا آشیانہ
پانی میں ڈوبا ہوا پاتا ہے!

میرا دل، سیب کا درخت ہے، جسے پالا مار گیا ہے!
میرا دل، سیپ ہے جس سے موتی نکال لیا گیا ہے!
میرا دل سب سے بڑا ہے،
آسمان سے بھی اور عرشِ الٰہی سے بھی،
مگر یہ آباد دُنیا، آج اُجاڑ ہے،
اس کے کھنڈروں میں اُلّو بیٹھے بول رہے ہیں،
کیونکہ وہ چلی گئی ہے،
خدا اُس سنگ دل سے سمجھے!

"ہند"

تیتری سے

اے حسین تیتری! میں تجھے خدا کا واسطہ دیتا ہوں، تجھے اپنی عزیز جان کی قسم، میرے نزدیک ٹھیر، کچھ دیر اور میری آنکھوں کے سامنے رقص کر، میرے سامنے سے اس قدر جلد غائب ہو کر میرے پُرشوق دل کو، جو صدہا تمناؤں کی آماجگاہ بنا ہوا ہے پامال نہ کر، میری تمناؤں کا اپنی اس بے رُخی سے خون نہ کر!

ننھی سی تیتری تو کس قدر معصوم، کس قدر بھولی بھالی اور کس درجہ سادہ لوح ہے۔ تجھے میری حالت کا مطلق علم نہیں۔ تجھے اس کا بھی علم نہیں کہ میرے دل کی گہرائیوں میں تجھ کو ایک نظر دیکھ لینے کے بعد کون سے خیالات، کس کس قسم کے جذبات پیدا ہو جاتے ہیں۔

کاش! میں تجھے اپنا محبت سے لبریز دل دکھا سکتا، کاش! تجھے بھی اس کا علم ہوتا کہ میں تجھ سے کیوں محبت کرتا ہوں، تجھ کو کیوں پیار کرتا ہوں! ناداں تیتری! تو نہیں جانتی تیرا ننھا سا نازک دل اُن سب تفکرات، اُن سب خیالات سے پرے، کوسوں دُور ہے! میں تجھے صرف اس لئے پیار کرتا ہوں کہ تو مجھے میرے بچپن کے گذشتہ دلفریب جذبات و حالات کی یاد دلا دیتی ہے! ماضی کی یاد میرے بربطِ دل کے ساز پر چھڑ جاتی ہے تجھ کو دیکھ کر میں خیالات و جذبات کے سمندر میں تنکے کی طرح بہنے لگتا ہوں اور اُس وقت وہ گذشتہ حسین و دلفریب مناظر میری نظر کے سامنے رقص کرنے لگتے ہیں! وہ بھولے ہوئے نغمے پھر یاد آ جاتے ہیں، وہ تصاویر پھر میری آنکھوں کے سامنے پھرنے لگتی ہیں جب میں ایامِ طفلی میں اپنے والدین کے ساتھ اپنے قدیم موروثی مکان میں بےفکری کے ساتھ معصومانہ کھیلوں میں وقت گذارتا تھا، لیکن زندگی کے ان خوشنما اور راحت کو خزاں کے ایک جھونکے نے فضا میں پریشان کر دیا! اور یہ اس بات کا ثبوت دے کر چلے گئے کہ دُنیا اور دنیا کی ساری مسرتیں فانی ہیں!!

اس لئے تو میری آنکھوں سے اس قدر جلد اوجھل نہ ہو، تھوڑی دیر اور اس خاموش حسین فضا میں رقص کر تاکہ میں کچھ دیر اور اپنے ماضی کی یاد سے اپنا دل خوش کر لوں! ننھی سی جان! میری بات مان لے۔ تجھ کو خدا کا واسطہ دیتا ہوں۔ کچھ دیر اور ٹھیر! اس طرح مجھے پریشان بنا کر فضا میں یکایک گُم نہ ہو جا!!

اے نازک تیتری! کیا تو بھی اس کا تصور کر سکتی ہے کہ کس قدر دلچسپ! کس قدر پُرلطف، اور کس درجہ حقیقی محبت سے لبریز تھے وہ لمحے، وہ ساعات، جبکہ میں بچپن میں اپنی بہن کے ساتھ کھیل میں مصروف ہوتا! کیا تجھے بھی وہ دن یاد ہیں جبکہ میں تجھ کو ایک نظر دیکھ کر دیوانہ وار تجھ کو پکڑنے کی خواہش کرتا۔ شوق کی موجیں میرے دل میں رہ رہ کر تھپیڑے مارتیں اور میں تجھ کو پکڑنے کے لئے پروانہ وار ایک جھاڑی سے دوسری جھاڑی تک تیرا پیچھا کرتا تو میری گرفت سے نکل کر چھوٹے چھوٹے حسین پودوں پر جا بیٹھتی اور جونہی میں ہزاروں تمناؤں کو اپنے پُرشوق دل میں دبا کر تجھ تک پہنچتا تو دھوکا دے کر میرے ہاتھ سے بچ کر نکل جاتی۔ میں اس پر بھی ہمت نہ ہارتا لیکن میری بہن ڈرتی تھی، بے حد وہ تیرے نرم نرم ریشمی قوسِ قزح جیسے پروں کو پکڑنے سے ڈرتی تھی! اُس کا ننھا سا دل دھڑکنے لگتا۔ جانے کیوں!؟

اس لئے اے حسین تیتری! میں پھر تجھ سے دست بستہ آخری بار یہی التجا کرتا ہوں کہ تو اس قدر جلد میری آنکھوں سے دُور نہ جا۔ تجھے میری قسم، کچھ دیر اور ٹھیر! اے حسین تیتری!.....

جمیل احمد

نقد و نظر

حامد کے سو شعر

اس چھوٹی سی خوبصورت کتاب میں جناب حامد علی خاں صاحب جائنٹ اڈیٹر رسالۂ ہمایوں کے منتخب اشعار جمع کئے گئے ہیں۔ ابتدا میں راقم الحروف کی طرف سے ایک دیباچہ شامل ہے جس میں حامد صاحب کی شاعری کی دلکش و دلفریب خصوصیات کو واضح کیا گیا ہے کتاب اعلیٰ درجے کے ولایتی کاغذ پر رنگین چھپی ہے قیمت چھ آنے۔ ہندوستانی کتب خانہ ماڈل ٹون لاہور کے پتے سے طلب فرمائیے۔

حقیقتِ جاپان

مولفہ شیخ محمد بدرالاسلام صاحب بی اے بی ٹی علیگ۔ یہ کتاب دو حصوں پر مشتمل ہے پہلے حصے میں شیخ صاحب کی سیاحت جاپان کے حالات ہیں اور دوسرے حصے میں جاپان کے معاشرتی و تمدنی اور اقتصادی، تعلیمی اور تجارتی کوائف درج ہیں۔ مصنف کئی سال تک جاپان کے مدرسۃ السنۂ خارجہ میں ایک پروفیسر کی حیثیت سے کام کرتے رہے ہیں اس عرصے میں انہوں نے اس ملک کو غائر نظر سے دیکھا ہے اور وہاں کے مناظر، رسم و رواج، صنعت و حرفت اور جاپانیوں کے عادات و اطوار کا ایک نہایت صحیح اور واضح نقشہ کھینچا ہے۔ جاپان کے متعلق اس سے پہلے بھی چند قابلِ قدر کتابیں لکھی جا چکی ہیں لیکن وہ صرف وہاں کے حالات کے کسی ایک پہلو پر روشنی ڈالتی ہیں۔ یہ کتاب ہر حیثیت سے مکمل ہے اور ایشیا کے اُس ترقی یافتہ ملک سے ہمیں متعارف کراتی ہے جس کا طرزِ عمل اس وقت ایک دنیا کی سیاسیات اور اقتصادیات پر اثر انداز ہو رہا ہے حجم ۰۰۔۴ صفحات پندرہ عکسی تصاویر بھی کتاب کی زینت ہیں قیمت مجلد تین روپے آٹھ آنے غیر مجلد تین روپے۔ ملنے کا پتہ :۔ انجمنِ ترقیٔ اردو اورنگ آباد۔ دکن

مہدی

یہ کتاب مشہور انگریز افسانہ نگار رہال کین کے ایک معرکتہ الآرا ناول کا اردو ترجمہ ہے۔ اس کے مترجم پنجاب کے نامور ادیب میاں اسلم صاحب ہیں جن کی تصانیف مقبولیتِ عامہ کا درجہ حاصل کر چکی ہیں اور کثرت سے پڑھی جاتی ہیں۔ اس کتاب کو انہوں نے بڑی محنت اور جوش سے لکھا ہے اس لئے ان کی کتابوں میں اسے ایک امتیازی حیثیت حاصل ہے۔ یہ سرزمین مصر کی ایک داستان ہے جس میں آزادی کے لئے مسلمانوں کی جد و جہد کے کارنامے بیان کئے گئے ہیں۔ حُسن و عشق کی چاشنی نے کہانی کو بہت دلچسپ بنا دیا ہے کتاب پانچ سہ رنگ تصویروں اور ایک خوشنما سرورق سے آراستہ ہے۔ کاغذ کتابت اور طباعت بہت عمدہ۔ حجم ۴۰۰ صفحات قیمت مجلد تین روپے۔ ہاشمی بک ڈپو۔ سریانوالہ بازار لاہور سے منگائیے۔

فانوسِ خیال

یہ معاشرتی افسانہ نواب امین الدین احمد صاحب والی ریاست لوہارو کی ایک قابلِ قدر تصنیف ہے۔ اس میں لڑکیوں کی مرضی کے خلاف شادی کر دینے کے بُرے نتائج کی طرف توجہ دلائی گئی ہے افسانہ عبرت آموز ہونے کے علاوہ نہایت دلچسپ ہے زبان صاف ستھری اور شگفتہ ہے۔ حجم ۱۵۶ صفحات قیمت ایک روپیہ۔ ملنے کا پتہ :۔ مکتبۂ جامعہ۔ قرول باغ دہلی۔

ریحانہ

عہدِ فاروقی کی ایک دلکش تاریخی کہانی ہے جسے مولانا کوکب جوالاپوری نے تصنیف کیا ہے۔ مولانا عربی اور فارسی ادب سے گہری واقفیت رکھتے ہیں اور تاریخی معلومات پر انہیں کافی عبور حاصل ہے۔ "ادبی دنیا" کے ناظرین ان سے اور اُن کے مضامین سے اچھی طرح واقف ہیں اس لئے مجھے مزید تعریف کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔ کتاب کا حجم ۲۳۲ صفحات اور قیمت آٹھ آنے۔ پتہ :۔ ریحانہ بک ڈپو۔ ولایت بلڈنگ۔ برکت علی روڈ۔ لاہور

کاروبار

یہ تجارتی اور صنعتی رسالہ کچھ عرصے سے لاہور سے شائع ہو رہا ہے۔ اس کے متعدد پرچے ہماری نظر سے گذر چکے ہیں اور ہم کہہ سکتے ہیں کہ اس کی کارآمد تجارتی معلومات اور صنعتی و اقتصادی مضامین ہمارے ملک کے نوجوانوں کی بڑی حد تک رہنمائی کر سکتے ہیں۔ جناب عبدالحلیم خاں صاحب بی اے اس کے ایڈیٹر ہیں اور وہ خود ایک سنجیدہ کاروباری آدمی ہیں۔ سالانہ چندہ دو روپے۔ فی پرچہ دو آنے۔ پتہ :۔ رسالہ کاروبار۔ انارکلی بازار۔ لاہور۔

منصور احمد

فہرست مضامین "ادبی دنیا"

جلد ۱۱ بابت ماہ نومبر ۱۹۳۴ء نمبر ۲

تصویر: سیب

سالانہ چندہ چار روپے سات آنے محصول اور وی پی نو آنے کل پانچ روپے ممالک غیر سے دس شلنگ

ہندوستان کے وہ بلند پایہ ادبا جن کے مضامین سالنامہ کی زینت ہیں

ڈرامے

(۱) آغا حشر کاشمیری
(۲) نور الٰہی محمد عمر صاحبان۔
(۳) پروفیسر الیشور چندر نندا ایم۔اے
(۴) مولانا شاہد احمد صاحب دہلوی بی۔اے آنرز مدیر ساقی۔
(۵) مسٹر اندر لال داس صاحب قمر بی اے
(۶) ملک عطاء اللہ صاحب کلیم ایم اے

افسانے

(۱) منشی پریم چند صاحب
(۲) حضرت خواجہ حسن نظامی صاحب
(۳) مرزا فہیم بیگ صاحب فہیم چغتائی
(۴) مولانا حامد علی خاں صاحب جائنٹ ایڈیٹر "ہمایوں" لاہور
(۵) مرزا عظیم بیگ صاحب بی اے ایل ایل بی (علیگ)
(۶) محمد نعمان خاں صاحب ایم۔اے
(۷) حضرت وقار انبالوی
(۸) جناب انعام الحق صاحب شیدائی
(۹) حضرت حمدی۔
(۱۰) چودھری محمد اقبال صاحب بی اے (علیگ)
(۱۱) سید ابوالفضل صاحب حیدر آبادی
(۱۲) حضرت آسی رام نگری
(۱۳) حضرت طاہر قریشی
(۱۴) راجہ مہدی علی خاں
(۱۵) محترمہ طاہرہ دیوی صاحبہ شیرازی
(۱۶) شیخ مقبول الٰہی صاحب بی اے آنرز
(۱۷) کامران ایم۔اے۔

علمی و ادبی مضامین

(۱) رائٹ آنریبل سر عبدالقادر سابق ممبر انڈیا کونسل
(۲) حضرت خواجہ حسن نظامی
(۳) حضرت علامہ برجموہن صاحب دتاتریہ کیفی دہلوی
(۴) حضرت آرزو جلیلی ایم ایس سی پروفیسر سائنس کالج
(۵) سید حسن صاحب برنی بی اے ایل ایل بی ایڈوکیٹ
(۶) مسٹر حمید احمد خاں صاحب ایم اے پروفیسر اسلامیہ کالج
(۷) حضرت ظفر قریشی بی۔اے آنرز دہلوی
(۸) مولانا سید تمکین کاظمی، ایم۔اے، ایم آر۔اے۔ایس
(۹) سید وقار عظیم صاحب ایم۔اے
(۱۰) حضرت منظور سرور شش بھرپالی
(۱۱) سید بادشاہ حسن صاحب حیدر آبادی
(۱۲) پروفیسر آر آر کبریا ایم۔اے
(۱۳) حضرت نسیم رضوانی ایم۔اے
(۱۴) حضرت کلیم ایم۔اے
(۱۵) پروفیسر رام سروپ شاستری بی۔اے

شعرائے نادرہ طراز جن کا کلام سالنامہ میں درج ہے

(۱) حضرت جوش ملیح آبادی
(۲) حضرت آزاد انصاری مدظلہ
(۳) خان بہادر سید رضا علی صاحب وحشت
(۴) سید احمد حسین صاحب امجد حیدر آبادی
(۵) ابوالاثر حفیظ جالندھری
(۶) حضرت احسن مارہروی
(۷) حضرت اختر شیرانی
(۸) پروفیسر سید عابد علی صاحب عابد
(۹) مرزا جلال الدین صاحب اکبر
(۱۰) حضرت صبائی
(۱۱) حضرت صدق جائسی
(۱۲) حضرت ساغر نظامی
(۱۳) سید عبدالحمید صاحب عدم
(۱۴) حضرت کلیم ایم۔اے
(۱۵) حضرت تاباں بریلوی
(۱۶) لالہ تلوک چند صاحب محروم
(۱۷) جناب اندر جیت صاحب شرما
(۱۸) حضرت فراق گورکھپوری
(۱۹) حضرت وقار انبالوی
(۲۰) صوفی غلام مصطفےٰ صاحب تبسم
(۲۱) حضرت ضیا فتح آبادی
(۲۲) حضرت حفیظ ہوشیارپوری
(۲۳) جناب سکندر علی صاحب وجد حیدر آبادی
(۲۴) محترمہ ح۔ب صاحبہ
(۲۵) سید علی منظور صاحب حیدر آبادی
(۲۶) حضرت منظر صدیقی
(۲۷) جناب امر چند صاحب قیس جالندھری
(۲۸) حضرت راشد وحیدی

بزمِ ادب

ادارۂ "ادبی دنیا" کی ہمیشہ سے یہ کوشش رہی ہے کہ نظم و نثر کے وہی نمونے قارئین کی خدمت میں پیش کرے جو اپنی صنف میں بہترین ہوں۔ سالنامہ کے مضامین کے عنوانات پر ایک جھلکتی ہوئی نظر ڈال لیئے تو گلہائے رنگارنگ کا ایک تو ایسا انبار نظر آئے گا جس کی شادابی ہر ادب نواز شخص کو دعوتِ نظارہ دے گی، سالنامہ کی ترتیب میں یہ خاص طور پر خیال رکھا گیا ہے کہ ہر فن کے ماہرین کو یکجا کر دیا جائے اور اس کا بھی التزام کیا گیا ہے کہ ان کے جو مضامین اس میں شامل ہوں وہ خاص طور سے اسی نمبر کے لیئے فکر کیئے گئے ہوں

ڈرامے

اب کی بار سالنامہ کی ایک امتیازی خصوصیت فن ڈراما اور ان عظیم الشان شخصیتوں کا ذکر ہے جو اس فن کے ناخدا تسلیم کئے گئے ہیں۔ شیکسپیر ہند آغا حشر صاحب کے ایک معرکۃ الآرا ڈرامے کے چند مناظر ہوں گے اس کے ساتھ ہی یہ انتظام کیا گیا ہے کہ ڈراما لکھتے ہوئے جو مراحل آغا صاحب طے کرتے ہیں اور جو اسلوب وہ مد نظر رکھتے ہیں اس کے متعلق خود آغا صاحب کے قلم سے ایک مضمون ہو، پروفیسر ایشور چند رنندا ایم۔اے بھی جن کے ڈرامے پنجاب میں بیحد مقبول ہو چکے ہیں "ادبی دنیا" کے کرم فرماؤں میں شامل ہیں، انہوں نے اپنے بہترین پنجابی ڈرامے "لّلی دا بیاہ" کا نہایت خوش اسلوبی سے اردو ترجمہ کرایا ہے، محمد عمر، نور الٰہی صاحبان نے بھی اپنی دیرینہ شرکت کی شاندار روایات کو محفوظ رکھتے ہوئے زبان اور معاشرت کا ایک نادر کارنامہ قارئین "ادبی دنیا" کی نذر کیا ہے، شاہد احمد صاحب دہلوی بی۔اے آنرز مدیر "ساقی" نے سیٹرلنک کے ایک شاہکار کا ترجمہ اس خوبصورتی سے کیا ہے کہ اصل کو بھی مات کر دیا ہے، اس کے علاوہ حضرت کلیم ایم۔اے اور مسٹر اندر لال داس صاحب قمر کے طبعزاد ڈرامے بھی ہوں گے، حضرت کلیم کا تاریخی ڈراما "فریبِ دولت" دلچسپ بھی ہے اور سبق آموز بھی، حضرت قمر نے اپنے ڈرامے میں ہندوستانی معاشرت کے ایک تاریک پہلو کو بے نقاب کیا ہے، اور خانگی بدمزگیوں کا ایک لطیف طریقے سے اظہار کیا ہے۔

افسانے

افسانہ نگاروں کی فہرست میں ہمیں منشی پریم چند صاحب اور جناب عظیم بیگ صاحب چغتائی جیسی مایہ ناز ہستیوں کے نام نظر آتے ہیں۔ منشی پریم چند صاحب ہندوستان میں فطرت کی ترجمانی میں سب سے پیش پیش ہیں، اور مرزا عظیم بیگ صاحب چغتائی مزاحیہ رنگ کے افسانے لکھنے والوں میں اپنی نظیر آپ ہیں، مولانا حامد علی خاں صاحب بی۔اے ایڈیٹر "ہمایوں" اپنے انداز کی دلکشی کے جوہر دکھاتے ہیں۔ فہیم بیگ صاحب چغتائی نے بھی اپنے مخصوص طرز میں ایک افسانہ سپردِ قلم کیا ہے۔ حضرت وقار انبالوی نے اپنے افسانے میں دیہات کی زندگی کے اچھوتے مناظر دکھلائے ہیں۔ ان کے علاوہ مولانا محمد نعمان صاحب ایم۔اے کا طبعزاد افسانہ بھی قابلِ ذکر ہے جس میں آپ نے مزاحیہ اسلوب کو قائم رکھتے ہوئے نفسیاتی کیفیات کی بھی کماحقہٗ ترجمانی کی ہے، اس کے علاوہ اور بہت سے نام ہیں جو قلت گنجایش کی وجہ سے رہے جاتے ہیں۔

ادبی مضامین

"ادبی دنیا" کے تمام مضامین نہایت کاوش و تدقیق سے لکھے جاتے ہیں خصوصاً تحقیقی مضامین پر تو تمام توجہات مرتکز کیجاتی ہیں اور اس حیثیت سے "ادبی دنیا" کی برتری بارہا تسلیم کی جا چکی ہے سالنامہ کی اور خصوصیتوں میں رائٹ آنریبل سر عبدالقادر، سابق ناظم حیدرآباد، حضرت خواجہ حسن نظامی کے بیش قیمت مضامین نیز حضرت کیفی دہلوی کے گراں قدر مضمون "اردو شاعری کا پہلا مشاعرہ" اور مولانا سید حسن برنی کے بیش قیمت مقالہ "الازدی کی تاریخ فتوح الشام" سے ایک نمایاں اضافہ ہو گیا ہے۔ مولانا تمکین کاظمی نے ایک محققانہ مضمون میں جانِ عالم واجد علی شاہ کی بیگم کے حالاتِ زندگی اور ان کی علمی فضیلت پر بحث کرتے ہوئے وہ محبت آمیز منظوم خطوط بھی نقل کئے ہیں، جو محترمہ نے اپنے شوہر کو وقتاً فوقتاً لکھے، سید وقار عظیم صاحب ایم۔اے نے اردو غزلوں میں مقامی اثرات کو فارسی اثرات کے برابر کا حصہ دار بتایا ہے۔ حضرت کلیم نے اپنے مضمون میں فارسی شاعری میں جدید تحریکات کے اثرات کو وضاحت سے بیان کیا ہے، جناب مقبول الٰہی صاحب کا ایک پرمغز مقالہ

میں بتایا ہے کہ آج سے دس سال بعد صحافت کی حالت کیا ہوگی۔ حضرت منظور سرورش بھوپالی کا مضمون قوتِ فیصلہ بھی ایک ایسی چیز ہے جو ہر صاحب ذوق کی نظر سے گزرنا چاہیئے۔

ادبِ لطیف

حسین و لطیف مضامین میں شاعرِ حیات ٹیگور کے جدید ترین نغمے، کلیم احمد کا مضمون عورت اور آرٹ، اور حضرت عظیم قریشی کے راد ھاکے گیت خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔

مزاحیہ

مزاحیہ حصے کو اس دفعہ خاص طور پر نمایاں کیا گیا ہے۔ افسانوں ڈراموں اور دوسرے مضامین میں اس شعبے کو بھی خاص اہمیت دی گئی ہے

حصۂ نظم

جس طرح مضامینِ نثر کو یہ خصوصیت حاصل ہے کہ وہ صرف سالنامۂ ادبی دنیا ہی کے لئے سپردِ قلم کئے گئے ہیں اسی طرح سالنامے کی نظموں کو بھی یہ امتیاز نمایاں کر رہا ہے کہ وہ سالنامے ہی کے لئے کہی گئی ہیں، جہاں ان میں قدیم انداز کی شگفتہ اور شوخ غزلیں ہیں وہاں ان میں جدید مضامین اور جدید طرز کی نظمیں بھی ہیں اور جدید شعرا نے شاعری میں طرز و اسلوب کی جو جدتیں پیدا کی ہیں ان کی آئینہ دار ہیں ان کے عنوانات دینا تو بے سود ہے صرف ان محترمین کے اسماء میں سے چند درج کئے جاتے ہیں جن کے افکار گوہر بار سے آپ کو محظوظ ہونا ہے۔ حضرت جوش ملیح آبادی حضرت آزاد انصاری، حضرت حفیظ جالندھری، حضرت صدق جائسی۔ حضرتِ اختر شیرانی، حضرت احسن مارہروی، حضرت ساغر نظامی، محترمہ ح۔ب صاحبہ، صوفی غلام مصطفےٰ صاحب تبسم۔ حضرت جلال الدین اکبر حضرت فراق گورکھپوری، حضرت وحشت کلکتوی، حضرت عدم، حضرت عابد لاہوری حضرت امجد حیدرآبادی، لالہ تلوک چند صاحب محروم۔ حضرتِ اثر صہبائی حضرت حفیظ ہوشیارپوری، حضرت ضیا فتح آبادی، سید علی منظور حیدرآبادی حضرتِ منظر صدیقی اکبرآبادی،

متذکرہ بالا قادر الکلام شعرا کی طرف سے مختلف موضوعات پر نظمیں، غزلیں، گیت اور سانیٹ ہیں جن کو روحِ شعر و شاعری کہا جا سکتا ہے۔

تصاویر

سالنامے کی تصویریں تمام دنیا کے فنِ مصوری اور جدید و قدیم آرٹ کے شاہکاروں کا ایک مرقع ہیں۔ توقع کی جاتی ہے کہ ہندوستان کے مایۂ ناز مصور حضرتِ چغتائی بھی اپنی کوئی تصویر سالنامے کے لئے مرحمت فرمائیں گے یک رنگی تصویروں کے ساتھ ساتھ کثرت سے سہ رنگی تصاویر بھی اس میں شامل ہیں تصاویر میں سے بعض تو وہ ہیں جو یورپ اور امریکہ کی آرٹ گیلریوں کی زینت ہیں۔ جہاں صرف مستند چیزیں ہی بار پا سکتی ہیں، یہ تصاویر بصرفِ کثیر حاصل کی گئی ہیں، ان کے علاوہ کچھ تصاویر ایسی ہیں جو ہمارے باذوق دوستوں نے اپنے نادر و نایاب مرقعوں سے سالنامہ کے لئے ہمیں مرحمت فرمائی ہیں!

محترم خریداروں کے نام

اپنی تمام ہنگامہ خیزیوں کے ساتھ سالنامہ ماہ دسمبر میں انشاء اللہ شائع ہو جائے گا اور اس کی بہت زیادہ مصروفیتوں اور کثرتِ کار کے باعث ہم دسمبر کا عام نمبر شائع نہ کر سکیں گے۔ ثانیاً یہ کہ جس پریس میں "ادبی دنیا" چھپتا ہے سالنامہ کی طباعت کے باعث اس کو بھی اتنی فرصت اور مہلت نہ ہوگی کہ وہ سالنامہ کے علاوہ دسمبر کے عام نمبر کے لئے بھی وقت نکال سکے، اس لئے ناظرین کرام نوٹ کر لیں کہ دسمبر کا عام نمبر ان کی خدمت میں نہ پہنچے گا۔

مذکورہ ایک پرچہ کی کمی پورا کرنے کا ہم نے یہ طریقہ سوچا ہے کہ ہم ایک خریدار کی مدت خریداری میں ایک ماہ کی توسیع کر دیں گے!

سالنامہ جس کی قیمت سوا روپیہ ہوگی بذریعہ وی پی بھیجا جائے گا جس کا وصول کرنا ادبی دنیا کے ہر بہی خواہ کا ایک اخلاقی فرض ہوگا

اگر کوئی صاحب سالنامہ خریدنا نہ چاہیں تو براہ کرم ایک کارڈ لکھ کر دفتر ادبی دنیا کو مطلع فرما دیں تاکہ دفتر وی پی کے نقصان سے محفوظ رہے

سالنامہ ایک محدود تعداد میں چھاپا جا رہا ہے۔ ختم ہو جانے پر کسی قیمت پر بھی دستیاب نہ ہو سکے گا، کیونکہ اس کا دوسرا ایڈیشن چھاپنے کا ابھی ارادہ نہیں ہے ایسا نہ ہو کہ اس وقت کی غفلت آپ کو کلیتہً سالنامہ ہی سے محروم کر دے

ہیڈ ماسٹر صاحبان کے نام

ادبی دنیا کا سالنامہ چونکہ ماہ دسمبر میں تمام خریداروں کو بذریعہ وی پی بھیجا جا رہا ہے اور آپ میں سے بعض حضرات پرچہ بذریعہ وی پی وصول نہیں فرماتے ہیں بلکہ بل طلب کیا کرتے ہیں اس لئے استدعا ہے کہ جلد سے جلد اس امر کی اجازت دیجئے کہ سالنامہ خدمت والا میں بھیج دیا جائے اور ساتھ ہی بل بھی ارسال کر دیا جائے۔ سالنامہ کی قیمت سوا روپیہ ہوگی اور دسمبر کے وسط تک انشاء اللہ شائع ہو جائے گا۔

منصور احمد

آئینۂ عالم

مخلوط تعلیم

کملابائی گرل سکول بنگلور میں رائیٹ آنریبل وی ایس سری نواس شاستری صاحب نے لڑکیوں اور لڑکوں کی مخلوط تعلیم پر بدیں الفاظ اظہار خیال کیا۔

ہندوستان میں اکثر مقامات پر لڑکیوں اور لڑکوں کی اکٹھی تعلیم نہیں ہو رہی۔ گمان کیا جاتا ہے کہ اس میں بہت سے خطرات ہیں میرے نزدیک عورت اور مرد کو علیحدہ علیحدہ فضا میں تربیت دینے کی کوشش کرنے کے بعد ان سے یہ توقع کرنا بیہودہ امر ہے کہ وہ جمع ہو کر امور حیات کو سرانجام دے سکیں گے۔ میں یہ سمجھتا ہوں کہ اس تعلیم میں خطرات بھی ہیں لیکن ہمیں دانشمندی سے انہیں رفع کرنے کی کوشش کرنی چاہیئے۔

آج کل کتابوں کے علاوہ رسالوں میں بھی عورتوں کے لئے کچھ صفحات محفوظ رکھے جاتے ہیں۔ گو میں دیگر طبقہ سے متعلق ہوں لیکن ان صفحات کا مطالعہ کرنے کے بعد میں اکثر اپنے آپ سے کہتا ہوں "کاش یہ میری ماں بھی ان باتوں کو جانتی ہوتی"۔ اور حقیقت یہ ہے کہ اچھی ماں بننے کے لیئے یہ ضروری ہے کہ لڑکیوں کو فلسفۂ اطفال اور اسی طرح کے دیگر مضامین کی تعلیم دی جائے۔ آج کل کے اسکولوں میں بھی کافی مفید علم کی تدریس کی جا رہی ہے۔ میرے نزدیک ہر ایک طرح کا علم ضروری ہے۔ میرے خیال میں اُن لوگوں کا نظریہ غلط ہے۔ جو یہ کہتے ہیں۔ کہ عورتوں کی تعلیم مردوں سے بالکل مختلف ہونی چاہیئے۔ میرا خیال یہ ہے کہ تعلیم کی دو ندیاں ایسی ہونی چاہئیں جو بعد میں چل کر دریا کی شکل اختیار کرلیں۔ لیکن یہ ضروری نہیں۔ کہ وہ ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہوں۔ بیوی کسی صورت میں بھی خاوند کے لیئے مفید معاون نہیں ہو سکتی۔ اگر اس کی تعلیم خاوند سے بالکل مختلف ہو۔ اس لیئے مردوں اور عورتوں کی تربیت اکٹھی ہونی چاہیئے۔

سائنس اور جنگ

سر جیمز جینز نے برٹش ایسوسی ایشن ایبرڈین میں خطبہ صدارت پڑھتے ہوئے اس نظریہ کی مخالفت کی کہ سائنس نے دنیا کو فایدے کی بجائے زیادہ نقصان پہنچایا ہے۔

انھوں نے کہا کہ جو ملک سائنس کی ترقی کو پسند نہیں کرتا۔ وہ ہر لحاظ سے دوسرے ممالک سے پیچھے رہ جائے گا۔ یہ صحیح ہے کہ سائنس کی ایجادات نے چند ایک آدمیوں کو بیکار کر دیا ہے۔ لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ ان کی بدولت کئی لاکھ آدمیوں کو روٹی کمانے کا موقع مل گیا جو آدمی یہ چاہتے ہیں کہ ایک دفعہ دنیا پھر اسی حالت میں واپس آجائے جب دنیا میں کوئی مشین موجود نہیں تھی۔ انہیں معلوم ہونا چاہیئے کہ اُس وقت ان لوگوں کو تجارت کے سلسلہ میں اس قدر پیچیدگیوں کا مقابلہ نہیں کرنا پڑتا تھا جس قدر آج کل کرنا پڑتا ہے۔ اور نہ ہی ان لوگوں کو بمباروں سے محفوظ رہنے کے لیئے وسائل مہیا کرنے پڑتے تھے۔

اگر سائنس کی بدولت جنگ میں نہایت خوفناک حملے کئے جاتے رہے ہیں تو یہ بھی ضرور ہے کہ ان حملوں کی مدافعت کے لئے بھی سائنس نے مفید ذرائع مہیا کئے تھے۔ اور یہ لازمی ہے کہ جوں جوں سائنس خوفناک آلاتِ تباہی کے پیدا کرے گی ویسے ہی مدافعت کے آلات بھی تخلیق ہوں گے، ان حالات سے یہ نتیجہ نہیں نکل سکتا کہ سائنس کی ترقی کے ساتھ جنگ کا ہونا ضروری ہے کم از کم یہ کہا جا سکتا ہے کہ سائنس کی بدولت جنگ زیادہ خطرناک نہیں رہے گی۔

سائنس کی بدولت انسان نے اپنے آپ پر قابو پانے سے پہلے قدرت پر قابو پالیا ہے۔ سائنس کا علم نسلاً بعد نسل منتقل ہو رہا ہے لیکن اکتسابی خصوصیات منتقل نہیں ہوتیں۔ اس طرح علم کے لحاظ سے ہر ایک نسل یکساں طور پر بہرہ ور ہے۔ یہ حقایق ہیں جن کو تبدیل نہیں کیا جاسکتا۔ اور بہت ممکن ہے کہ آیندہ نسلوں کی یہی کمزوری انسان کی تباہی کا باعث ہو۔

افسانہ نویسی

مغربی افسانہ نویس مسٹر ایچ۔ جی۔ ویلز کی عمر اس وقت ۷۰ سال ہے حال ہی میں ان کی خود نوشت سوانح عمری شائع ہوئی ہے آپ اس وقت تک بہت سی کتابیں لکھ چکے ہیں۔ لیکن اس کے باوجود وہ اس امر کے معترف ہیں۔ کہ کتابیں تصنیف کرنا بالخصوص افسانے لکھنا آسان کام نہیں۔ ایک دفعہ انہوں نے کہا۔ کہ اُن کے اکثر ناول تکمیل سے قبل مندرجہ ذیل نو مدارج طے کرتے ہیں۔

۱۔ کسی موضوع کو سوچنے کی پریشانی اور اُلجھن

۲۔ موضوع کی معیاری حیثیت سے جانچ اور پرکھ۔

۳۔ ایک موضوع کو ترک کر کے دوسرے کو اختیار کرنا۔ اس پر فکر کرنے کے بعد اسے چھوڑ دینا اور پھر پہلے موضوع کو اختیار کرنا۔

۴۔ بعد ازاں آغاز

۵۔ تن دہی سے کام کرنا اور اپنے آپ کو یقین دلانا کہ یہ کام ہو سکتا ہے۔ اس لیے ضرور کرنا چاہیئے۔

۶۔ مذکورہ موضوع کے متعلق جو مواد مل سکے یا ذہن میں آئے اُسے قرطاس پر منتقل کرنا۔

۷۔ تشکیل اور دوبارہ لکھنا۔

۸۔ تصحیح اور تمام مضمون کو دوبارہ ٹائپ کرنا۔

۹۔ اشاعت کے وقت نگرانی۔ اس سلسلہ میں پروف کئی دفعہ پڑھنے پڑتے ہیں۔

ہمارے افسانہ نویسوں کے لئے ان بیانات میں بہت کچھ غور و فکر کے قابل ہے۔

انسان اور تہذیب کا آغاز

ڈاکٹر رادھا کمل مکرجی پروفیسر لکھنؤ یونیورسٹی نے "انسان اور تہذیب کے آغاز" پر تقریر کرتے ہوئے فرمایا۔

جب سورج اور ایک آوارہ ستارہ کے اتفاقی طور پر ایک دوسرے کے سامنے آنے سے زمین کائنات میں داخل ہوئی تو انسان بالکل غیر محسوس طور پر معرض وجود میں آگیا۔ اور پہلے پہلے وہ بالکل کیا جانور تھا۔

تقریباً دس لاکھ سال کا عرصہ گذرا ہے کہ ہمالیہ اور انسان بیک وقت معرض وجود میں آئے۔ جوں جوں سطح زمین بڑھتی گئی۔ درجہ حرارت کم ہوتا گیا۔ اور جنگلات بھی کم ہو گئے۔ بن مانس یا غیر مکمل انسان میدان میں نکلنے پر مجبور ہو گیا۔ سطح ارض پر جنگلی اور شکاری درندوں کے درمیان زندہ رہنے کے لئے اس نے صرف ذہنی طاقت سے ہی کام نہیں لیا۔ بلکہ ان آفات کا مقابلہ کرنے کے لیئے اس نے اپنی اجتماعی حیثیت کو بھی کافی مضبوط کیا۔

یہ حکم آسانی سے نہیں لگایا جاسکتا۔ کہ اُس وقت ازدواج کا کونسا طریقہ رائج ہوا۔ ایک خاوند کے پاس ایک بیوی ہوتی تھی یا زائد یا ایک بیوی کا ایک خاوند ہوتا تھا یا بہت سے۔ بہرحال شادی کا انحصار بیشتر جنسی ضروریات پر تھا۔ ابتدائی سوسائٹی کا تصور صرف یہی کیا جاسکتا ہے کہ بہت سے خاندان جمع ہو کر جنگلات کے کنارے کنارے گھومتے تھے۔ اور اقتصادی حالات صرف موسم پر منحصر تھے۔ موسیقی اور رقص کا آغاز اس وقت ہوا۔ جب شکاری شکار میں فاقہ اور دیگر صعوبتوں کو برداشت کر کے واپس لوٹتے تھے۔

برف کا زمانہ گذرنے پر آب و ہوا موجودہ معیار پر آگئی۔ اور صفحہ ارض پر جنگلات بڑھنے لگے۔ کاشت کے لیئے موزوں زمین پر جنگلات کے پھیلاؤ کا تدارک کرتے ہوئے انسان نے آگ دریافت کی۔ آگ نے سوسائٹی کی تعمیر کی۔ دعوتیں، رقص، موسیقی اور قصہ خوانی تمام آگ کی روشنی میں سرانجام پاتی تھیں۔ چونکہ اس سے سوسائٹی کی تعمیر ہوتی تھی۔ اس لیئے اس کو مقدس بھی سمجھا جانے لگا۔ جنگلات کو صاف کرنے، خوراک پکانے اور گھر کی کئی دیگر ضروریات میں آگ کا استعمال قدرت اور انسان کے اتحاد کا ایک روحانی مظاہرہ تھا۔

جوں جوں ہموار میدان پر کاشتکاروں کی تعداد بڑھتی گئی۔ وہ رفتہ رفتہ ڈیلٹاؤں اور نشیبی زمینوں کی طرف پھیلتے گئے۔ یہاں سیلابی

زمین سے دور رہنے کی غرض سے مصنوعی آب رسانی کے طریقے ایجاد کئے گئے۔

دیہات کا آغاز بھی ندیوں کا پانی تقسیم کرنے اور فصل کا انتظام کرنے کی وجہ سے ہوا۔ دیہاتی لوگ پہلے پہلے خود ہی کاشتکاری کرتے اور آب رسانی کا انتظام کرتے۔ لیکن بعد میں اقتصادی امور کے انتظام کے لیے پنچایت کی تشکیل کی گئی۔ اس طرح دیہات میں ابتدائی دیمق طراطی حکومت قایم ہوئی

جنگلات چراگاہیں اور میدان ہمارے مخصوص معتقدات، رسم و رواج اور تمدنی اداؤں کی تخلیق کے ذمہ دار ہیں۔ اور اس وقت انسان اپنے آیندہ کاموں کے لیئے ان قدرتی ذخائر سے گرانقدر تجربہ حاصل کر چکا ہے۔ قومی نشانات، مقدس آگ کا استعمال اور دھرتی ماتا کا عقیدہ ہمارے تمدن میں اسی طرح ملا ہوا ہے جیسے گائے، گھوڑے یا اونٹ کی پرستش،

وہ تہذیب جو جنگلات کے گہوارہ میں پل کر بڑی ہوئی تھی، چراگاہوں میں چلنے لگی تھی اور میدانوں اور ڈیلٹاؤں میں جوان ہوئی۔ اب پھر اُلٹے پاؤں جا رہی ہے۔ جوں جوں آبادی بڑھتی جاتی ہے۔ انسان چراگاہوں پر دست تطاول دراز کر رہا ہے۔ اور انہیں تباہ کر رہا ہے۔ اس کا ہل پہاڑیوں پر چڑھ رہا ہے۔ اور وہ صرف جنگلات کو ہی تباہ نہیں کر رہا۔ بلکہ زراعت اور دستکاری کے لیئے جانوروں کو بھی تباہ کر رہا ہے۔ انسان کی یہ یک طرفہ کارفرمائیاں دنیا کے توازن کو خراب کر رہی ہیں۔ اور جنگلات اور چراگاہوں کے خلاف اس کے مجرمانہ افعال کی اُسے سزا بھی مل رہی ہے میسوپوٹیمیا اور سندھ کی تہذیب کا محض اس لیئے افسوسناک انجام ہوا کہ انسان کے بے پرواہاتھوں نے اس بے دردی سے درختوں کو اکھاڑا تھا کہ ملک کی حالت بالکل دگرگوں ہوگئی۔ ایران، شام اور مصر بھی محض اسی وجہ سے خشک ہوگئے ہیں۔ اور بعض علاقے بود و باش کے بالکل ناقابل ہیں۔

تہذیب کی بنیادیں صرف اسی صورت میں پختہ ہوسکتی ہیں۔ جب انسان اور قدرت میں رابطۂ اتحاد قایم ہو۔ انسان نے جو آلات اور ہتھیار اپنی خوراک مہیا کرنے کے لیئے ایجاد کئے تھے۔ ان کو اس نے قدرت کے اور خود اپنے خلاف اس طرح استعمال کیا ہے۔ کہ اس طرح سلسلۂ ارتقا منقطع ہوتا جا رہا ہے۔ قدرت اور انسان کے اتفاق میں ہی انسانی تہذیب کے ارتقا کا راز مضمر ہے

مخلوط تعلیم اور خواتین پنجاب

مسز لے ریلیفی فنانشل کمشنر کی اہلیہ محترمہ نے خواتین پنجاب کی ایجوکیشنل کانفرنس کی صدارت فرماتے ہوئے تعلیم کے متعلق جن گرانقدر خیالات کا اظہار فرمایا وہ درج ذیل ہیں۔

مجھے یہ کہنے کی چنداں ضرورت نہیں کہ ہماری تعلیمی حالت بہت افسوسناک ہے پنجاب میں ہزار عورتوں میں سے صرف دو عورتیں ایسی ہونگی جو تعلیم سے بہرہ ور ہیں، ہمیں محکمہ تعلیم کا ممنون ہونا چاہیئے جس نے اپنی استطاعت سے بڑھ کر اس معاملہ میں حوصلہ دکھایا ہے مگر مجھے افسوس ہے کہ لڑکیوں کے مدارس میں مذہبی تعلیم پر توجہ نہیں دی جاتی، ہمیں کسی حالت میں بھی اخلاقی اور مذہبی تعلیم کو نظرانداز نہ کرنا چاہیئے۔

مجھے اعتراف ہے کہ میں مخلوط تعلیم کی مخالف ہوں، میں تسلیم کرتی ہوں کہ بچپن میں لڑکے لڑکیوں کو مخلوط تعلیم سے کوئی نقصان نہیں، اگر آٹھ سال تک لڑکے لڑکیاں اکٹھے پڑھیں تو کوئی حرج نہیں لیکن اس عمر کے بعد میں مخلوط تعلیم کو مفید نہیں سمجھتی، لڑکے لڑکیوں کو شروع ہی سے مختلف قسم کی تعلیم دینی چاہیئے، اس لئے اگر مخلوط تعلیم کے دوسرے عیوب سے قطع نظر بھی کی جائے۔ جب بھی یہ ماننا پڑے گا کہ مخلوط تعلیم سے لڑکے لڑکیوں دونوں کی علمی حالت ناقص ہو جاتی ہے مجھے محکمہ تعلیم کی مشکلات کا پورا احساس ہے پھر بھی اس بات پر زور دیتی ہوں کہ مخلوط تعلیم کے اجرا سے پہلے مقامی حالات کا صحیح طور پر مطالعہ کر لینا چاہیئے۔

ہمیں اعلیٰ تعلیم کی اہمیت کو بھولنا نہ چاہیئے، ہمارے ملک میں اعلیٰ تعلیم کا مقصد سرکاری ملازمت ہوتا ہے لیکن لڑکیوں کے معاملہ میں والدین کا مطمع نظر یہ ہوتا ہے کہ لڑکیاں اچھی بیویاں بننے کی اہل ہو جائیں۔

یہ بات کون نہیں جانتا کہ موجودہ نصاب تعلیم عورتوں کیا مردوں کے لیئے بھی بیکار محض ہے، میں یونیورسٹی کی موجودہ مساعی کو اس لئے قابل تعریف سمجھتی ہوں کہ وہ خانہ داری کی تعلیم کو اپنے نصاب میں شامل کر رہی ہے، میں جس قسم کی تعلیم کی ضرورت محسوس کرتی ہوں وہ آکسفرڈ اور کیمبرج کے نمونہ پر ہے، وہاں تعلیم کا مقصد حصول ملازمت نہیں بلکہ ملک کی رہنمائی کی تعلیم ہے۔

میں اپنی بہنوں سے درخواست کرتی ہوں کہ صنعت و حرفت کو فروغ دینے کی کوشش کریں۔ خوشحال خواتین کا نظریہ زندگی یہ نہیں ہونا چاہیئے کہ وہ ہاتھ پر ہاتھ دھر کر بیٹھی رہیں، ملک کی اقتصادی حالت اسی صورت میں بہتر ہوسکتی ہے کہ زراعت اور صنعت کو ترقی دینے کی کوشش کی جائے ہر عورت کو اپنے ملک کی خدمت کے لئے ہر ممکن کوشش کرنی چاہیئے۔

التجائے دید

کب تک یوں ہی مشقِ ستم و ناز کرو گے
کب تک نہ درِ لطف و کرم باز کرو گے

تم قہر کے پردے میں بھی ہو مائلِ الطاف
ہم دیکھیں گے افشا جو نہ یہ راز کرو گے

تم حسن کے سلطاں ہو لگاؤ گے جسے ہاتھ
گر زاغ بھی ہے تم اسے شہباز کرو گے

یہ رسمِ وفا جس کو مٹاتے ہو جہاں سے
تم آپ اسی رسم کا آغاز کرو گے

کیوں کھینچتے ہو، کیوں مجھ کو گراتے ہو نظر سے
میں وہ ہوں کہ تم مجھ پہ کبھی ناز کرو گے

ق

تم مجھ کو بھلا دو میں تمہیں یاد کروں گا
اس بات کو کیسے نظر انداز کرو گے!

امکاں نظر آتا نہیں لیکن یہ یقیں ہے
تم آؤ گے اور مجھ کو سرافراز کرو گے

پھر ڈالو گے مجھ پر وہی مخمور نگاہیں
یعنی کہ درِ مے کدہ پھر باز کرو گے

پھر پوچھو گے مجھ سے گل و بلبل کا کچھ احوال
پھر حسن و محبت کو ہم ساز کرو گے،

پھر کر کے اشارہ کہ کلیمؔ اب ہو غزل خواں
لاہور کو ہم پایۂ شیراز کرو گے

عطاء اللہ کلیم

غزل

عجب نہیں جو محبت مری سرشت میں ہے
یہی شرارِ نہاں روحِ سنگ و خشت میں ہے

ابھی نگاہ پہ ہیں رسم و وہم کے پردے
ابھی نگاہ طلسماتِ خوب و زشت میں ہے

یہ رنگ و نور کے جلوے، یہ دلکشا نغمے
صنم کدے ہیں کہ ذوقِ نظر بہشت میں ہے

نہ بجلیوں کو خبر ہے نہ خوشہ چیں کو پتہ
کہ اک نہالِ محبت ہماری کشت میں ہے

یہ ساکنانِ حرم سے پتہ چلا عابد
کہ ڈھونڈنے جسے نکلے ہو وہ کنشت میں ہے

عابد لاہوری

غزل

انہیں نگاہوں کو ڈھونڈھتا ہوں ترے تغافل سے تنگ ہو کر
ٹھہرا سکا تھا اوروں سے [illegible] دل میں [illegible] ہو کر

کنارہ کش اب میں چار دن تک جفائے پیہم سے تنگ ہو کر
بنا کسی مُنہ پہ خشکیٔ لب اڑا کسی رُخ سے رنگ ہو کر

کوئی نہ دیکھے کوئی نہ سمجھے تو غفلت اُس کی قصور اُس کا
تمہیں کو ہر شخص دیکھتا ہے مثالِ آئینہ دنگ ہو کر

خبر نہیں برق تھی بلا تھی نگاہ تھی یا ادا تھی کیا تھی
خدا سے انصاف کا ہوں طالب بُتوں کے ہاتھوں سے تنگ ہو کر

غنیمت اے عشق دم ہی تیرا جہاں میں یکساں کرم ہے تیرا
کہ خونِ بُلبُل دمک رہا ہے گلوں کے چہرے پہ رنگ ہو کر

نہ لعل و گوہر میں یہ صفا ہے نہ چاند سورج میں یہ ضیا ہے
یہ دل کو تسکین دیں گے کیونکر خود اس قدر شوخ و شنگ ہو کر

چلا ہوں کعبے کو بُتکدے سے خیال کی سادگی تو دیکھو
پناہ اُس چشمِ خشمگیں سے پڑی جو شیشے پہ سنگ ہو کر

چھپانے سے ظلم کب چھپا ہے نہیں یہ شانِ خدا تو کیا ہے
یہ صدق کے شعر ہیں ستمگر چلیں گے ہر سُو خدنگ ہو کر

بنے ہیں شوخی سے برق پیکر قرار سے بیٹھنا ہے دوبھر

کڑی نظر سے کسی نے دیکھا کہ ہو گیا دل ہزار ٹکڑے

اگر ہو بزمِ سخن میں تُو بھی تو بیٹھنا دُور زد سے ہٹ کر

صدق جائسی

عورت کی فتح

ایکسپریس ٹرین فراٹے بھرتی جارہی ہے۔ سیکنڈ کلاس کے ایک ڈبے میں میاں بیوی کے درمیان جو شادی کے چوتھے دن ہی سیر و سیاحت کو روانہ ہو گئے تھے۔ اور آج تقریباً دو مہینے کے بعد واپس آ رہے ہیں۔ مندرجہ ذیل پرلطف گفتگو ہو رہی ہے۔

بیوی۔ مجھ سے کچھ نہ پوچھو۔

میاں۔ لیکن میں تم سے پوچھنا چاہتا ہوں۔ اور پوچھ کر رہوں گا۔ میں مدت سے اس موقع کا منتظر تھا۔

بیوی۔ مدت سے؟ تم مدت سے پوچھنا چاہتے تھے۔ کہ میں نے تم سے کیوں شادی کی۔ درانحالیکہ ہماری شادی کو ابھی دو ہی مہینے گزرے ہیں۔

میاں۔ جب سے تم نے مجھے خاوند کی حیثیت سے "قبول" کیا ہے۔ میں اُسی دن سے حیران ہوں کہ اس کا کیا باعث ہو سکتا ہے۔

بیوی۔ میں نے تمہیں اس لئے "قبول" کیا کہ میں تم سے شادی کرنا چاہتی تھی اور میں نے تم سے اس لئے شادی کی کہ میں تمہاری بیوی بننا چاہتی تھی۔ تمہارے اطمینان کے لئے یہ کافی ہے؟

میاں۔ (سنجیدگی سے) ہرگز نہیں۔

بیوی۔ بہتر اس کے سوا تمہیں کوئی جواب نہیں ملے گا۔ (وہ اپنے ہاتھ کی انگلیوں سے دریچے کے شیشے کو کھٹکھٹانے لگی)

میاں۔ میری جان سنو! ہم دونو ایک خوفناک غلطی کے مرتکب ہوئے ہیں اور میں خطرہ محسوس کر رہا ہوں۔ کہ مبادا ہمارا سنجوگ تباہی و بربادی کا باعث ہو۔

بیوی۔ تم تو پہیلیاں بجھواتے ہو۔

میاں۔ اب ہمیں اس گتھی کو سلجھا دینا چاہیئے۔ تم بھی صاف گو ہو۔ اور میں بھی۔ جو کچھ ہمارے دلوں میں ہے۔ اس کا چھپانا نہ تمہارے اختیار میں ہے۔ نہ میرے۔ ہم آپ اپنے حق میں کانٹے بو رہے ہیں۔

بیوی۔ تو پھر ہمیں اس معاملے کو پسِ پشت ڈال دینا چاہیئے۔

میاں۔ یہ نہیں ہو سکتا۔ تھوڑی ہی دیر میں ہم اپنے گھر ہوں گے۔ وہی روزمرہ کی زندگی ہوگی۔ میں اپنے کام پر چلا جاؤں گا۔ اور تم گھر بار سنبھالو گی۔ اس لئے جو آگ میرے دل کو جلا رہی ہے۔ اُس کا فرو کر دینا ضروری ہے۔ میں تم سے پوچھتا ہوں۔ کہ تم نے مجھ سے کیوں شادی کی؟

بیوی۔ (غصہ سے) تم سخت بے رحم ہو اور ناانصاف بھی۔ کوئی عقلمند آدمی اس قسم کے احمقانہ سوال نہیں کرتا۔

میاں۔ مجھے بسا اوقات یہ خیال ستاتا ہے۔ کہ تم نے مجھ سے میری دولت کی وجہ سے شادی کی ہے۔

بیوی کا چہرہ یک لخت سرخ ہو جاتا ہے۔ اور پھر سفید اُس نے اپنی نگاہیں کھڑکی سے باہر جماتے ہوئے کہا۔

بیوی۔ تم نے زندگی بھر اس سے زیادہ فاش غلطی نہیں کی ——— ایک خوفناک غلطی۔

میاں۔ لیکن یہ میرا قصور نہیں۔ ہر شخص جب دیکھتا ہے کہ شادی محبت کی بنیادوں پر قائم نہیں تو قدرتی طور پر وہ کوئی اور سبب دریافت کرنے کی کوشش کرتا ہے۔

بیوی کوئی جواب نہیں دیتی۔ اس خاموشی سے حوصلہ پا کر وہ اپنا سلسلۂ کلام جاری رکھتا ہے

اگر تم اس کی توضیح نہ کرو گی۔ تو اس کا یہ مطلب ہے۔ کہ مجھے اپنے خیالات پر قائم رہنے کا موقع دو گی۔

بیوی۔ گویا ایک دفعہ صاف گو کہنے کے بعد اب تم مجھے اس کے خلاف سمجھتے ہو۔

میاں۔ تم اپنے آپ کو فریب دے سکتی ہو۔ لیکن مجھ پر یہ جادو نہیں چل سکتا۔ بہرحال تم نے مجھ سے محبت کے سوا کسی اور وجہ سے شادی کی ہے۔

بیوی۔ میں تمہاری گفتگو سے سخت بیزار ہوں۔

میاں۔ میں تم سے زیادہ بیزار ہوں خاص کر اُن خیالات کی وجہ سے جنہوں نے میرے دماغ کو اپنی جولانگاہ بنا رکھا ہے۔

بیوی۔ تو پھر جس طریقے سے تمہیں مسرت حاصل ہو سکتی ہے۔ کرو!

میاں۔ میں ضرور کروں گا۔ بشرطیکہ تم مجھے حقیقت سے آگاہ کر دو۔ مجھ سے آدمی کے لئے دماغی پریشانی سے بڑھ کر اور کوئی عذاب نہیں۔

بیوی خاموش ہے۔ گاڑی اپنی پوری رفتار کے ساتھ جا رہی ہے۔

میں کہہ سکتا ہوں کہ اگر تمہاری شادی کرنے کی وجہ مجھے معلوم ہو جائے۔ تو وہ بہرحال اُن وجوہ سے کہیں بہتر ہوگی جو میرے دل و دماغ میں چکر لگا رہی ہیں۔

بیوی۔ ہوگی۔

میاں۔ میرے دل میں دولت سے بھی زیادہ خطرناک وجوہ موجود ہیں۔

بیوی۔ براہ کرم مجھے ان کی تفصیل سے معاف رکھئے۔ کم از کم ایک ذی ہوش انسان ایسے جذبات کو ہمیشہ اپنی ذات تک محدود رکھنے کی کوشش کرتا ہے۔

میاں۔ مجھے اعتراف ہے۔ کہ میں ذی ہوش نہیں ہوں۔ لیکن دیانت دار ضرور ہوں۔ اور ایک دیانت دار شخص کو بہت جلد فریب دیا جا سکتا ہے۔

بیوی خاموش ہے۔ غصہ سے اپنے ہونٹ کاٹ رہی ہے۔ نگاہیں بیرونی منظر پر جمائے ہوئے ہے۔ گاڑی اُڑی جا رہی ہے۔

میاں۔ (دردناک آواز میں) میں تم سے التجا کرتا ہوں کہ مجھے اس جانکاہ عذاب سے نجات دو۔ ہمیں گھر میں قدم رکھنے سے پیشتر اس امر کا تصفیہ کر لینا چاہیئے۔ اگر ہمیں ایک دوسرے کے خیالات و جذبات سے آگاہی ہو جائے۔ تو ہم اپنے آپ کو مستقبل کے لئے تیار کر سکتے ہیں کم از کم مجھے اپنی ذات پر اعتماد ہے۔ لیکن میں اُس سوانگ کو جو گذشتہ آٹھ ہفتوں میں ہم نے اختیار کر رکھا تھا۔ زیادہ دیر تک برداشت نہیں کر سکتا۔

بیوی۔ تاہم تم نے اس سوانگ کو خوب نباہا۔

میاں۔ جتنا اچھا نباہا کب اتنی جلدی ختم ہوتا ہے۔

بیوی۔ سنو! میں نے تم سے اس لئے شادی کی کہ تم "احمق" تھے۔

میاں کے چہرے کا رنگ بدل جاتا ہے۔

میاں۔ ذرا اس کی تفصیل کیجئے۔

بیوی سر جھکا لیتی ہے۔ اور سسکیاں لینے لگتی ہے۔

بیوی۔ تمہیں ایک ایسی عورت سے شادی کرنی چاہیئے تھی۔ جس کے پہلو میں دل نہ ہوتا اور دل میں جذبات نہ ہوتے۔ تم جانتے ہو۔ میں نے اپنی زندگی کس ماحول میں بسر کی ہے۔ میرے ابا جان کتنے ہوشیار ہیں۔ ہمیشہ ایسی گفتگو کرتے ہیں۔ جو دانشمندانہ پہلو لئے ہوتی ہے اور وہ دوسروں سے بھی اسی بات کے متوقع ہیں۔ یہی حال اماں جان کا ہے۔ اور میری بہنیں بھی اسی رنگ میں رنگی ہوئی ہیں۔ لیکن میرا اپنا یہ حال تھا کہ اُن کے مقابلے میں صفر کی حیثیت رکھتی تھی۔ میری تصویریں جن پر میں اپنی تمام امکانی قوتیں اور قابلیت صرف کر دیتی تھی۔ اُن کے لئے سامانِ تضحیک تھیں۔ آہستہ آہستہ میرے دل میں یہ خیال جم گیا کہ میں بیوقوف ہوں۔ اور آخر مجھے محبت بھی اُس شخص سے ہوئی جو ———

میاں۔ (مضطرب ہو کر) شکریہ! شکریہ!!

بیوی۔ نہیں پیارے۔ میری مراد اس سے تمہاری ذات نہیں۔ تم اس کا کچھ خیال نہ کرو۔

——— مجھ پر جلدی ہی یہ بات واضح ہو گئی کہ یہ سب لوگ ظاہردار ہیں۔ اس لئے مجھے اُن سے نفرت ہو گئی اور ایسا ہونا قدرتی امر تھا۔ تم اس معاملے کو سمجھنے کی کوشش کرو اور مجھ سے بہتر سلوک کرو۔

ابا جان کے واقف کاروں میں ایسے ایسے بھی تھے۔ جو اتنی دولت کے مالک ہیں۔ کہ ہمارے پاس اُس کا عشر عشیر بھی نہیں۔ اُن میں سے کئی ایک مجھ سے شادی کرنے کے خواہشمند تھے۔ اور انہوں نے ہر ممکن طریق سے مجھے اپنے دام میں لانے کی کوشش بھی کی۔ لیکن میں نے ان سب پر تم کو ترجیح دی۔

میاں۔ غالباً طبیعت کی مناسبت کی وجہ سے۔

بیوی۔ تم ایک عورت کو سمجھنے میں غلطی کرتے ہو۔

میاں۔ مجھے تم سے اتفاق نہیں۔

بیوی۔ (غمگین انداز سے مسکراتے ہوئے) مجھے افسوس ہے۔ کہ تمہیں

تکلیف ہو رہی ہے۔

میاں۔ تم میری تکلیف کی پروا نہ کرو۔ میں نے تم سے حقیقت دریافت کی تھی۔ سو مجھے معلوم ہو گئی۔ تم نے مجھ سے اس لئے شادی کی کہ میں بیوقوف ہوں۔ کیا میری حماقت کو تم نے از خود معلوم کیا تھا یا تمہارے گھر والوں نے تم کو بتایا تھا؟

بیوی۔ آہ۔ میں تمہیں کیونکر سمجھاؤں۔ پہلے پہل جب تم سے میری ملاقات ہوئی۔ تو میں تمہاری طرف کھچ گئی۔ اور یہ کشش روز بروز زیادہ ہوتی گئی۔ یقیناً یہ ایک کافی و وافی دلیل ہے۔ کسی کو مطمئن کرنے کے لئے بشرطیکہ وہ مطمئن ہونا چاہے۔

میاں۔ نہیں مردوں میں بعض ایسے ہیں۔ جو اس سے زیادہ کے طلبگار ہیں۔ وہ محبت چاہتے ہیں۔ میں یہ نہیں کہتا کہ اچھے آدمی محبت کے خواہاں ہوتے ہیں۔ اور نہ محبت میرے نزدیک بذاتِ خود کوئی اچھی چیز ہے۔ بہرحال وہ اسے چاہتے ہیں۔ اور میرا بھی یہی حال ہے۔ یاد رکھو تم مجھ سے شادی کرکے ایک ہولناک غلطی کی مرتکب ہوئی ہو۔

بیوی۔ مجھے تمہاری حالت پر افسوس آتا ہے۔

میاں۔ کوئی شخص ——— مجھ سا ——— ہر وقت بیوقوف نہیں ہوتا۔ کبھی کبھی وہ عقلمندی کی باتیں بھی کیا کرتا ہے۔

بیوی۔ تم ایک ہی لفظ کی رٹ لگا رہے ہو۔ حالانکہ میں نے اس قسم کی کوئی بات تم سے نہیں کہی۔ مجھے اس کا اعتراف ہے۔ کہ میں گھر کے لوگوں سے تنگ آگئی تھی۔ اُن کی پُر از تکلف گفتگو اور اُن کے ظاہردارانہ سلوک سے جس میں اخلاص کا شائبہ تک نہ تھا۔ میں سخت تنگ آگئی تھی۔ وہ ہمیشہ ایسی باتیں کہتے جو حقیقت سے بعید ہوتیں۔ لیکن تم ان سب سے مختلف تھے۔ قطعاً مختلف۔

میاں۔ میں سمجھ گیا ہوں۔ سب کچھ سمجھ گیا ہوں۔ کہ تم نے مجھ سے کیوں شادی کی۔ مجھے میرے سوال کا جواب مل گیا ہے۔ اب مجھے مطمئن ہو جانا چاہیئے۔ لیکن میں نے تم سے کیوں شادی کی؟ غالباً تم اسے جاننا نہیں چاہتیں اور نہ تمہیں اس کی پرواہ ہے۔

(بیوی کچھ کہنے کو تھی کہ رُک گئی)

میں نے تم سے صرف محبت کی وجہ سے شادی کی۔ میں تم سے محبت کرتا تھا دل و جان کی گہرائیوں سے۔ میرا خیال تھا کہ تم میری زندگی کو خوشگوار بنا دو گی۔ میرے لئے اس پُر از مصائب دنیا میں فردوسِ نعمتیں مہیا کر دو گی ——— لیکن آہ یہ خیال بھی ایک احمقانہ خیال تھا ——— تم عقلمند تھیں۔ میں بیوقوف تھا۔

بیوی۔ تم غلط سمجھ رہے ہو۔ میں نے تمہیں ایک باعزت اور بااصول انسان سمجھ کر تم سے شادی کی۔ اور تم میں وہ تمام خوبیاں موجود پائیں جن کا میرے والدین کے گھر میں فقدان ہی نہیں بلکہ تمسخر اُڑایا جاتا ہے۔ میں نے تمہارے متعلق بہت عرصے سے سن رکھا تھا۔ اور میں تمہیں اچھی طرح جانتی تھی۔ بیس سال کی عمر میں تم پر ایک بڑے کنبے کا بوجھ آ پڑا۔ تم نے اپنی بیوہ ماں اور یتیم بہنوں کی جس تندہی اور جانفشانی سے خدمت کی۔ مجھے خوب معلوم ہے۔ تم نے اُن کے آرام و آسائش کے لئے دن کو دن اور رات کو رات نہ سمجھا آخرکار تمہارا اخلاص اور تمہاری محنت پھل لائی۔ اور تم ہر طرف سے سُرخرو ہوئے۔ کنبے کے حقوق کو بھی تم نے باحسن وجوہ ادا کیا اور اپنے لئے بھی دنیا میں ایک بلند و معزز مقام حاصل کر لیا۔ تمہارا چچازاد بھائی ہمیشہ تمہاری تعریف کے گیت گایا کرتا تھا۔

میاں۔ لیکن اُن سب میں طنزیہ پہلو ہوتا تھا۔

بیوی۔ یہ تمہارا خیال ہے۔

میاں۔ وہ مجھے ”دیانتدار“ کہا کرتا تھا۔ کیا میں اتنا نہیں سمجھ سکتا کہ اس سے اُس کی کیا مراد تھی۔

بیوی۔ کیا دیانتدار کا لفظ تمہارے لئے باعثِ عار ہے۔

میاں۔ ہے یا نہیں۔ مجھے اس سے بحث نہیں۔ لیکن اس کا اتنا اثر ہو سکتا تھا۔ کہ کوئی عورت میری طرف مائل نہ ہو۔ تم نے مجھ سے اس لئے شادی کی کہ میں تمہارے نزدیک نیک۔ باعزت اور بہت سی خوبیوں کا مالک تھا۔ اور میں ہمیشہ وہی باتیں کہتا تھا جو میرے دل میں ہوتی تھیں۔ اور میں نے کبھی منافقانہ طرزِ گفتگو اختیار نہیں کیا تھا۔ یا ان تمام باتوں کو صرف ایک لفظ میں ادا کر سکتا ہوں۔ جو تم نے ابھی کہا ہے کہ میں ”احمق“ واقع ہوا تھا۔

بیوی۔ ”احمق“ سے میرا مطلب وہ نہ تھا جو تم لے رہے ہو۔ تمہاری گفتگو سے میں اس قدر گھبرا گئی تھی کہ مجھے معلوم نہ تھا میں کیا کہہ رہی ہوں۔

میاں۔ خیر جو رائے تم نے میرے متعلق قائم کر رکھی تھی۔ دانستہ یا نادانستہ اس کا اظہار ہو گیا۔ تمہیں معلوم ہونا چاہیئے کہ جتنا نیک و بااصول

تم نے مجھے سمجھا تھا۔ درحقیقت اتنا نہیں ہوں۔

ایک طویل وقفہ۔ گاڑی پہاڑوں کے سلسلے میں سے
گزر رہی ہے۔ کمرے میں تاریکی چھا جاتی ہے۔ میاں
ایک ٹھنڈی سانس لیتا ہے۔ بیوی بالکل خاموش
ہے۔

میاں۔ میں ایک مزار ہوں جس پر سفیدی پھری ہوئی ہے۔ اور نقش و نگار بنے ہوئے ہیں۔

(خاموشی)

سمجھتی ہو میں کیا کہہ رہا ہوں۔

بیوی۔ (سرد مہری سے) سمجھتی ہوں۔

میاں۔ مرد عموماً اس قسم کی باتیں نہیں کیا کرتے۔ لیکن تم نے مجھے مجبور کر دیا ہے۔ دنیا میں ایسی عورتیں بہت کم ہیں۔ جو کسی مرد سے صرف اس لئے شادی کرتی ہیں۔ کہ وہ باعزت اور با اصول ہے ——— کم از کم میرا یہی خیال ہے۔

بیوی۔ لیکن فی الحقیقت یہ ایک سراب ہوتا ہے۔

میاں۔ (غصّہ سے) دیکھو! تم حد سے بڑھ رہی ہو۔ میں سب کچھ برداشت کر سکتا ہوں۔ لیکن ریاکار کہلانے کی مجھ میں ایک لمحے کے لئے بھی تاب نہیں۔

بیوی۔ ایک ایسے خاوند کے لئے جسے اپنی بیوی سے محبت نہ ہو یہی لفظ موزون ہے۔

میاں۔ کیا تم مجھے محبّت نہ کرنے کا الزام دیتی ہو۔ بہت خوب!

بیوی۔ (جوش سے) کیا کسی ایسے شخص سے جسے اپنی بیوی سے محبت ہو اس قسم کے ظالمانہ سلوک کی توقع ہو سکتی ہے؟

میاں کچھ خوفزدہ ہو جاتا ہے۔ اور مایوسانہ انداز سے
بیوی کی طرف دیکھنے لگتا ہے۔

بیوی۔ (سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے) محبت! محبت! تم کہتے ہو کہ میں نے محبت کی وجہ سے شادی کی ہے۔ اور مجھ سے بھی توقع رکھتے ہو کہ میں تمہاری بات کا اعتبار کر لوں۔ بے شک یہ درست ہے۔ اس لئے کہ تمہیں اپنے طور پر اس کا یقین ہے۔ تم نے محبت کے لئے شادی کی۔ لیکن میں نے نہیں کی۔ کس چیز کی محبت؟ میری شکل وصورت کی یا میرے کسی باطنی حسن کی؟ مرد صرف ظاہری حسن پر مرتے ہیں۔ باطنی خوبیوں کی پروا نہیں کرتے۔ فانی چیز سے محبت کرتے ہیں اس لئے وہ محبت بھی فنا ہو جاتی ہے۔ اگر تم نے میرے باطن کا مطالعہ کیا ہوتا۔ اور میرے کسی مستقل وصف سے محبت کی ہوتی۔ تو آج تم میرے ساتھ اس قسم کا سلوک نہ کرتے۔ محبّت! محبّت! بس ایک لفظ سیکھ لیا ہے۔ اور حقیقت یہ ہے کہ اس کے محل استعمال سے بھی واقفیت نہیں۔ تم مجھ سے بار بار پوچھتے ہو۔ کہ میں نے تم سے کیوں شادی کی۔ تو سنو! میں نے یہ نہیں دیکھا کہ تم خوبرُو ہو۔ سرو قد ہو۔ چلتے ہو تو خوابیدہ فتنوں کو جگاتے ہو۔ بات کرتے ہو تو پھول برساتے ہو۔ مسکراتے ہو۔ تو بجلیاں گراتے ہو۔ نہیں میں ان میں سے کسی ایک پر بھی مائل نہیں ہوئی۔ میری محبت کا باعث تمہارے وہ اوصاف تھے۔ جن کی وجہ سے تم ایک کامیاب انسان کہلانے کے مستحق ہو۔ اور بس یہ ہے اصل محبت کاش تم اسے سمجھتے اور میری قدر کرتے۔ لیکن جب تمہارے نزدیک محبت کا مفہوم محض حیوانی جذبات ——— (رُک جاتی ہے۔ اور کچھ دیر اپنے جوش کو دبانے کی ناکام کوشش کرتی ہے) سن لو اور سمجھ لو کہ تم میری نظروں میں اب وہ نہیں رہے۔ جو پہلے تھے۔ اور مجھے سخت ندامت ہے۔ کہ میں نے تمہیں سمجھنے میں غلطی کی۔

میاں۔ (گھبرا جاتا ہے) لیکن میری جان!

بیوی۔ بس اب "میری جان"، "میری جان" کرنے سے کچھ فائدہ نہیں۔ مجھے معلوم ہو چکا ہے۔ جو کچھ تم ہو۔ میں تم سے برملا کہتی ہوں کہ مجھے تم سے مطلق محبت نہیں۔ اور نہ میں نے محبت کی وجہ سے تمہارے ساتھ شادی کی۔

آنکھوں سے شعلے نکلنے لگتے ہیں۔ رخسارے تمتما
اُٹھتے ہیں۔ آواز میں لرزش پیدا ہو جاتی ہے۔

میاں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے۔ کہ ہم ایک مہلک دلدل میں پھنس گئے ہیں۔

بیوی۔ لیکن برخلاف اس کے شکوک وشبہات کے بادل چھٹ گئے ہیں اور راستہ ہمارے لئے صاف ہو رہا ہے۔ تمہارے سوال کا جواب جس کے تم مدت سے منتظر تھے مل گیا ہے۔ میں عرصے سے تم میں تبدیلی محسوس کر رہی تھی۔ اور جانتی تھی کہ جو آگ تمہارے دل میں سُلگ رہی ہے۔ اُس کے شعلے ایک دن تمہارے مُنہ کے راستے باہر نکلیں گے۔ بہرحال اچھا ہوا کہ معاملہ ہمارے صاف ہو گیا۔

میاں بیوی کے قریب تر ہو جاتا ہے۔ اور اُس
کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں تھام لیتا ہے۔ وہ کوئی
مزاحمت نہیں کرتی۔

بیوی۔ میں نے تم سے تمہارے غیر فانی اوصاف کی وجہ سے شادی کی۔ اور تم میرے فنا ہو جانے والے حُسن پر مائل ہوئے۔

میاں۔ میری پیاری! میں اعتراف کرتا ہوں۔ کہ میں نے تمہیں غلط سمجھا۔ واقعی مجھے عورت کی فطرت کے متعلق بہت کم علم ہے۔ تم جو کچھ کہو میں اُسے ماننے کو تیار ہوں۔

بیوی۔ اگر یہ بات ہے۔ تو میں حقیقت کے چہرے سے نقاب اٹھاتی ہوں۔ اور تمہیں بتاتی ہوں کہ میں نے تم سے کیوں شادی کی ——— اس لئے کہ تم ———
"احمق" تھے۔

میاں۔ ایسا نہ کہو۔ میری جان ایسا نہ کہو!

بیوی۔ کیا تم نے یہ خیال کیا تھا۔ کہ میں کسی راہب سے شادی کر رہی ہوں۔

میاں۔ مجھے معاف کرو پیاری!

بیوی۔ جب تم مجھ سے صرف میرے لئے محبت کرو گے۔ جس طرح میں تم سے کرتی ہوں تب ———

میاں۔ کہو اُرامِ جاں کہو چپ کیوں ہو گئیں۔

بیوی۔ تب میں تمہارا یہ الزام معاف کر دوں گی۔ کہ میں نے تم سے ———

میاں۔ بس بس مجھے معلوم ہو گیا کہ تم کیا کہنے کو ہو۔

بیوی۔ دولت کے لئے شادی کی ہے۔

میاں ندامت سے سر جھکا لیتا ہے۔ اور
گاڑی اسٹیشن کی حدود میں داخل ہو
جاتی ہے +

ماخوذ

حمدی

توبہ

کسی کے اندازِ کافری پر نمودِ رنگِ شباب! توبہ
ہمارے دل کا خدا ہی حافظ عذاب سا ہے عذاب! توبہ

نماز پڑھنے کو پڑھ رہا ہوں خیال دل میں آ رہا ہے
اگر کوئی آ کے سامنے سے اٹھا دے رُخ سے نقاب! توبہ

تیری نگاہوں کی مستیوں نے بتا دیا رازِ مے پرستی
جہاں نظر آیا مجھ کو ساغر وہیں ہوئی آب آب توبہ

یہ حُسن کی تمکنت قیامت ـ وفا سے توبہ جفا پہ قبضہ
ابھی تو ہے خیر سے لڑکپن مگر جب آیا شباب توبہ

وہ ہونٹ کانپے وہ چھلکے آنسو ٹپک اٹھی آبلے جگر کے
شب درازِ فراق توبہ ـ ہجومِ صد اضطراب توبہ

وہی ہوں میں جس سے کمسنی ہی میں تم طلبگارِ دل ہوئے تھے
اُسی محبت شعار واحد سے آج اتنا حجاب؟ توبہ

واحد قریشی

مُصوّر کا نظریہ

رنگوں میں چاندنی کو ملایا ہے بارہا
اَور پیکرِ بہار بنایا ہے بارہا

نغموں کے اہتزار کی تصویر کھینچ کر
موسیقیوں کا رقص دکھایا ہے بارہا

پیدا ہوئی ہے بربطِ دِل سے جو راگنی
رنگوں کی لَے میں اسکو سنایا ہے بارہا

ساکت مجسّموں کو عطا کی ہے زِندگی
تخلیق کا کمال دکھایا ہے بارہا

ٹپکی ہے مُو قلم سے مری دِقّتِ نظر
رُوحوں کو بے حجاب دکھایا ہے بارہا

راتوں کو اپنے ذہن کی تنویر کے لئے
اِدراک کا چراغ جلایا ہے بارہا

ہر نازک و لطیف تاثّر کو اے ندیم
صُورت پذیر کر کے دکھایا ہے بارہا

مِلتی نہیں ہے نغاہ مگر اپنے ذوق کی
گو دِل کی تشنگی کو بجھایا ہے بارہا

فنِّ لطیف کوئی بھی ہو ناتمام ہے
اور ناتمامیوں سے ہی اُسکو دوام ہے

عدمؔ

ٹالسٹائے اور اُس کی بیوی

ٹالسٹائے کی ایک اہم خصوصیّت یہ ہے۔ کہ وہ اِس دُنیا میں اُن آدمیوں کی طرح زندگی اور موت کے مراحل سے گزرا۔ جن کو دُنیا صحیح طور پر نہیں سمجھ سکی۔ کیونکہ اُس کی تمام زندگی اپنے آپ کو سمجھنے کی پُر جوش سعی" اور "شاندار ناکامی" سے عبارت ہے۔ ناکامی اِس لحاظ سے شاندار ہے۔ کہ ایک ناممکن الحصُول چیز کی تحصیل یعنی کائنات میں انسان کا رتبہ معلوم کرنے کے لئے اپنے آپ کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہوئے اُس نے ضمناً ادبِ یورپ میں بیش بہا خزائن کا اضافہ کیا۔

اُس کی ابتدائی ادبی کاوشوں کے نتائج "جنگ اور امن" اور "اینا کرنینا" (Anna Karenina) ایسے ناول ہیں۔ جو معیاری حیثیت سے اپنی زبان میں بہترین ناولوں میں شمار ہونے کے قابل ہیں۔ اُن کے امتداد، عمق، اور کردار کی تخلیق کا مطالعہ کرنے سے شکسپیئر اور بالخصوص 'ہیملٹ'[1] یاد آتا ہے۔ لیکن فرق یہ ہے کہ شکسپیئر انسانی کمزوریوں پر اُس خدا کی طرح تنقید کرتا ہے۔ جس کا علم انسانی علم سے بالاتر ہے۔ لیکن ٹالسٹائے یوں محسوس کرتا ہوا لکھتا ہے۔ جیسے وہ خود ہیملٹ ہے گو یا اُس کی تمام زندگی اِسی طرح بسر ہوئی ہے۔

بہت عرصہ سے مغربی مصنفین میں "ٹالسٹائے اور اُس کی بیوی کے تعلقات" کا مسئلہ باعثِ نزاع رہا ہے۔ اور یہ فیصلہ نہیں ہوسکا۔ کہ دونوں کی ایک دوسرے سے علیحدگی کا کون ذمہ دار تھا۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ صحیح معنوں میں اعاظم الرجال کی خانگی زندگی کے ایسے کوائف اُن کی عظمتِ شخصیت کا معیار نہیں بن سکتے۔ ہاں دلچسپ ضرور ہوتے ہیں۔ چنانچہ اِسی خیال سے ٹالسٹائے کی سب سے چھوٹی لڑکی سیشا نے اِن حالات کو اپنی تازہ تصنیف (The Tragedy of Tolstoy) میں قلمبند کیا ہے۔ ٹالسٹائے کی یہ لڑکی جس کا صحیح نام کاؤنٹس الگزینڈرا تھا۔ اُس کے آخر وقت تک اُس کے ساتھ رہی۔ اور بعد میں نو سال تک اپنی ماں کے ساتھ رہی۔ حتّٰی کہ وہ فوت ہوگئی۔ مذکورہ تصنیف میں وہ اپنی ماں کے آخری الفاظ کا اعادہ کرتی ہے۔

اُس نے کھانسی کی اذیت سے بمشکل سانس لیتے ہوئے کہا۔ "میں تمہیں بتانا چاہتی ہوں کہ میں ہی تمہارے باپ کی موت کا باعث ہوئی ہوں۔ میں اِس پر بہت متاسف ہوں۔ لیکن یہ حقیقت ہے۔ کہ میں عمر بھر اُس سے محبت کرتی رہی۔ اور ہمیشہ اُس کی وفادار بیوی تھی۔"

ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اِن الفاظ کے بعد کسی مزید بحث کی ضرورت نہ تھی۔ لیکن کاؤنٹس الگزینڈرا (سیشا) کو اِس کے متعلق بہت کچھ کہنا ہے۔ وہ بیباکی سے اپنے باپ کی حمایت کرتی ہے۔ اور اُس کے بیانات کافی دلچسپ ہیں۔

ٹالسٹائے کی بیوی ہر لحاظ سے ایک اچھی خاتون تھی۔ لیکن وُہ انتہا درجے کی پابندِ رسوم تھی۔ اُس کو اپنے خاوند کے آخری ایّام کے خیالات سے کوئی ہمدردی نہ تھی۔ وہ توانا، لائق اور وفاشعار لیکن عام بیویوں اور ماؤں کی طرح تھی اس کے تیرہ بچے تھے اور اُسے اس کی کوئی وجہ نظر نہ آتی تھی کہ اس کا خاوند اس کو کیوں مطمئن نہیں اس معاملے میں اُسے کسی اور عورت پر شبہ نہیں تھا جس سے خاوند کا ربط ہو اُسے صرف یہ شکایت تھی کہ ٹالسٹائے کا طرزِ عمل غیر منصفانہ ہے۔

لیکن اس میں دو نقص ضرور تھے۔ ایک تو اُسے ہر وقت یہ وہم رہتا تھا۔ کہ "دوسرے لوگ کیا کہتے ہوں گے"۔ اور دوسرے اُسے جنون کا دورہ ہوا کرتا تھا جس میں وہ اکثر خودکشی کی دھمکی دیا کرتی تھی۔ جب اُس کا سب سے چھوٹا محبوب لڑکا فوت ہوا۔ تو اُس وقت بھی وہ دیوانہ وار مکان کے اندر دوڑتی رہی۔ اور خودکشی کی دھمکی کو بار بار دہراتی رہی۔ اور جب اس کا خاوند تنگ آکر اُسے تنہا چھوڑ کر جانے لگتا۔ تو وہ اسی دھمکی کا اعادہ کیا کرتی۔ ٹالسٹائے ان مجنونانہ حرکات سے متنفر تھا۔ کیونکہ اس کا خیال تھا۔ کہ ان کی حقیقت کوئی نہیں۔ وہ جانتا تھا کہ اس کی بیوی کو اس کا اچھی طرح علم ہے۔ کہ وہ کبھی خودکشی نہیں کرے گی۔

---

[1] شکسپیئر کی تماثیل میں سے ایک تمثیل کا عنوان اور اسی تمثیل کا ایک کردار۔

جب بیاسی سال کی عمر میں ٹالسٹائے واقعی اپنی بیوی کو بھاگ کر روپوش ہوگیا۔ تو اس نے بظاہر کئی دفعہ اپنے آپ کو گاؤں کے جوہڑ میں ڈبونے کی کوششیں کیں۔ لیکن ہمیشہ اس وقت جبکہ لوگ اُس کے پاس بچانے کے لئے موجود ہوتے۔ اُس کی خواہش تھی کہ اُس کی ان کوششوں کی تفصیل اُس کے خاوند کو معلوم ہوجائے جس کی قیام گاہ کا اُسے علم نہیں تھا۔ چنانچہ لوگوں نے ٹالسٹائے کو ان واقعات کی اطلاعات ارسال کیں۔ اور اُس نے اپنی بیوی کو لکھا۔ کہ اُس کی اِن بے اختیارانہ حرکات کا مظاہرہ اس امر کا بیّن ثبوت ہے۔ کہ وہ اپنی روز افزوں نقاہت اور مخدوش صحت کے ہوتے ہوئے اُس کے ساتھ ایک ہی چھت کے نیچے نہیں رہ سکتا۔

ان واقعات کے دس دن بعد وہ فوت ہوگیا۔ اُس کی موت ایک ریلوے اسٹیشن پر واقع ہوئی۔ جبکہ وہ اپنی بیوی (سونیا) سے جان چھپانے کے لئے کاکیشیا جا رہا تھا۔ سیشا اس کے ساتھ تھی۔ اور وہی اُسے گاڑی سے اس وقت اٹھوا کر اسٹیشن ماسٹر کے مکان پر لے گئی۔ دورانِ سفر میں وہ نمونیا میں مبتلا ہوگیا تھا۔ اِس عالمِ مجبوری میں اُس نے ماسکو میں اپنے ایک بھائی کو بھی اطلاع دے دی۔ تاکہ وہاں سے کچھ طبّی مدد حاصل ہوسکے۔ ٹالسٹائے کی علالت کی خبر آگ کی طرح پھیل گئی۔ اور اسٹیشن ماسٹر کا گھر اخبارات کے نمائندوں سے پُر ہوگیا۔ سونیا اور خاندان کے دیگر افراد خاص گاڑی پر وہاں بہت جلد پہنچ گئے۔ لیکن ٹالسٹائے کو یقین تھا۔ کہ سیشا اور ڈاکٹروں کے سوا اس کی موجودگی کا کسی کو علم نہیں۔ خاندان کے کچھ افراد سونیا کی حمایت کرتے تھے۔ لیکن یہ سب کا متفقہ فیصلہ تھا۔ کہ ٹالسٹائے سے اس کی ملاقات اُس کی ہلاکت کا باعث ہوگی۔

اُس کی موت کے آخری دن سونیا نے اپنی آخری کوشش کی۔ لیکن ٹالسٹائے کو ملنے کے لئے نہیں بلکہ دنیا کو یہ یقین دلانے کے لئے کہ وہ اس کے آخری وقت میں اُس کے پاس تھی۔ مریض کے کمرے سے سیشا کو اپنی والدہ سے باتیں کرنے کے لئے بلایا گیا۔ لیکن اس نے جونہی بادلِ ناخواستہ کمرے کا دروازہ کھولا۔ اُسی وقت نمائندوں کے کیمروں کی فلمیں سرعت سے حرکت کرنے لگیں۔ سیشا نے جھٹ سے دروازہ بند کر لیا۔ اور واپس چلی گئی۔ اس کی ماں خود کیمرے والوں کو لے کر آئی تھی۔

چنانچہ سیشا لکھتی ہے۔ کہ اُس نے میری فہمائش کے جواب میں کہا۔ ”تم مجھے اُس سے دُور رکھنے کی کوشش کر رہی ہو۔ کم از کم دنیا پر تو یہ ظاہر کرنے دو۔ کہ میں اُس کے ساتھ ہوں۔“

اِس آخری موقع پر یہ افسانہ خوفناک ہوجاتا ہے۔ سیشا خوفِ مرگ کی تفصیلات غیر معمولی طور پر زیادہ بیان کرتی ہے۔ اُس کی والدہ کی ڈائری کی اشاعت کے بعد اُس کے باپ کے رویّہ کے لئے کسی صفائی کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ وہ عظیم الشان انسان تھا۔ اور اس کی ذہنی اور اخلاقی زندگی کے نمایاں عکس اس کی تصنیفات میں واضح طور پر موجود ہیں۔ یہاں تک کہ اس کی چہیتی بیٹی کے بیانات بھی اُس کی عظمتِ شخصیت کو اتنی وضاحت سے بیان نہیں کر سکتے۔

لیکن دنیا کو ابھی تک یہ مسئلہ حل کرنا تھا کہ میاں بیوی میں سے قصور کس کا تھا۔ گو یہ مسئلہ نہ دنیا کے لئے اہم ہے۔ اور نہ اس کا صحیح جواب ممکن تھا۔ سونیا چھوٹے بچے نہ ہونے کی وجہ سے غیر معمولی طور پر اپنے خاوند سے دلچسپی لیتی تھی۔ وہ اس کے لئے اُونی ٹوپیاں اور مفلر بنتی اور جب وہ سرد ہوا میں باہر نکلتا تو اُسے یہ کپڑے پہننے پر مجبور کرتی۔ اور اُس کی خوراک تیار کرنے پر بے حد سرگرمی کا اظہار کرتی۔ اور اُسے خواہ مخواہ تنگ کرتی۔

اِس مسئلے کی وضاحت ذیل کا ایک واقعہ کرتا ہے۔ تمام دنیا کو معلوم ہے۔ کہ ٹالسٹائے نے اپنے وضع کردہ اخلاقی عقائد کے مطابق وسط عمر میں گوشت کھانا ترک کر دیا تھا۔ ایک دفعہ اس کی بیوی کی بہن اُن کے ہاں مہمان ہوئی۔ اور اُس نے اس امر کی شکایت کی۔ کہ اُسے کھانے کے لئے گوشت بالکل نہیں ملا۔ سیشا لکھتی ہے۔

> ”چنانچہ ایک دن کھانے سے پہلے والد اور میری بہنیں ایک زندہ مرغی کو گھسیٹتے ہوئے کھانے کے کمرے میں لے آئے۔ اور اسے خالہ کی کرسی سے باندھ کر ایک چھری اس کی کرسی پر رکھ دی۔ خالہ حیران تھی کہ انہوں نے یہ کام کیوں کیا ہے۔ والد نے اُسے پریشان دیکھ کر کہا۔ کیوں! تمہیں نے تو کہا تھا کہ تمہیں کھانے کے لئے چوزے نہیں ملتے۔ اب چوزہ حاضر ہے۔ لیکن ہمارے پاس ایسا کوئی آدمی نہیں جو اسے ذبح کرنے کا ارادہ کر سکتا ہو۔ اِس لئے

ہم نے سارا سامان مہیا کر دیا ہے"۔

یہ تھے ٹالسٹائے کے مستحکم عقائد اور یہ تھا اس کا طریقہ جس کے ذریعہ وہ لوگوں سے اپنے عقائد منوایا کرتا تھا۔ لیکن اس کی بیوی سونیا کے عقاید بالکل مختلف تھے۔ وہ خود سبزی خور بننے پر آمادہ تھی۔ لیکن اُس کا خیال تھا کہ اس کے خاوند کو گوشت کی بہت ضرورت ہے۔ چنانچہ وہ باورچی سے سازباز کر کے اس کے شوربے میں یخنی کا پانی ملا دیا کرتی تھی۔

اب مسئلہ نہایت واضح ہو گیا ہے۔ کہ کون راہِ راست پر تھا۔ ٹالسٹائے یا اس کی کاؤنٹس اور باورچی؟ ظاہرا طور پر اُس کا جواب یہی ہے کہ دونو یا کوئی بھی نہیں یا یہ کہ اس کا علم کسی کو بھی نہیں۔

خاوند یا بیوی کے اخلاق کی تحلیل کرنے سے ملزم کسی کو بھی نہیں ٹھیرایا جا سکتا۔ ٹالسٹائے سے شادی کرنا آسان کام نہ تھا۔ اس کی بیوی کو یا تو کچھ بھی نہیں ہونا چاہئے تھا اور یا ولی۔ لیکن اتفاق سے وہ دونوں چیزوں میں سے ایک بھی نہیں تھی۔ وہ ایک دنیاوی مستقل مزاج عورت تھی۔ جو دنیا کے ہر ایک مرد کے لئے بہترین بیوی ثابت ہو سکتی تھی۔ ماسوا اُس مرد کے جس سے اس نے شادی کر لی تھی۔

کہا جا سکتا ہے کہ ٹالسٹائے آخری عمر میں مذہبی دیوانہ ہو گیا تھا لیکن اس کے باوجود اس کے خیالات میں کوئی جنون نہ تھا۔ صرف اس کی اُس گفتار و کردار میں بیہودگی تھی۔ جو وہ ان خیالات کے زیرِ اثر کرتا تھا۔ وہ اپنی انتہائی درجہ کی جذباتی تصنیف "کروزر سوناٹا" میں نغمے کو شیطان کا بچہ کہہ کر پکارتا ہے۔ اور غالباً اس کی ناکامیوں میں سے یہ سب سے بڑی ناکامی تھی کہ وہ بنی نوعِ انسان کو اپنی وساطت سے سمجھنا چاہتا تھا۔ ظاہر ہے کہ کسی وقت نغمے نے اس کے دل و دماغ میں حیوانی جذبات کو متہیج کیا تھا۔ لیکن اس سے یہ نتیجہ نہیں نکالا جا سکتا تھا۔ کہ ہر ایک انسان ان حالات میں اسی طرح متاثر ہوتا ہے۔ نغمے کا اثر صرف سامع کے ہنگامی رجحان پر منحصر ہے۔ ٹالسٹائے کی توضیح صرف اپنی ذات کی توضیح تھی۔ جو خاص وقت میں نغمے سے خاص طور پر متاثر ہوئی تھی۔ اور غالباً غیر معمولی طور پر کیونکہ اس میں بہیمیت یقیناً نام کو نہ تھی لیکن ایسا آدمی ایک عام دنیاوی عورت سے شادی کیسے کر سکتا تھا!

آخری عمر میں ٹالسٹائے حق بجانب تھا۔ سونیا اُسے پریشان کرتی تھی۔ اور وہ سونیا کو۔ وہ تنہائی پسند کرتا تھا لیکن اس کی بیوی کو یہ تشویش لاحق تھی کہ لوگ یہ سمجھیں گے کہ اُس کا خاوند اُسے چھوڑ گیا ہے۔ آخر اس نے کیا قصور کیا تھا جس کی پاداش میں وہ یہ ذلت برداشت کرتی۔

حقیقت اس سے زیادہ نہیں اور اس پر مزید بحث فضول ہے صرف یہ کہہ دینا کافی معلوم ہوتا ہے۔ کہ 'سونیاؤں' کو ایسی خطرناک ہستیوں سے شادی نہیں کرنا چاہئے۔ یہ امر باعثِ تعجب ہے کہ اتنی دیر تک وہ ایک دوسرے کو برداشت کیسے کرتے رہے۔ اُسے اپنی بیوی کو موت سے کم از کم بائیس سال پہلے چھوڑ دینا چاہئے تھا۔ حالانکہ وہ صرف دس دن پہلے اُس سے جدا ہوا۔ بہت ممکن تھا کہ اگر وہ جلدی اُسے چھوڑ کر چلا جاتا۔ تو دو تین سال اُسے اور زندہ رہنے کی مہلت مل جاتی۔ لیکن وہ اپنے مقصد میں کامیاب تھا۔ وہ بیاسی سال کا ہو چکا تھا۔ اور اب اُس کے پاس دنیا کے لئے اور کوئی پیغام نہ تھا۔

(اقتباس) نسیم رضوانی

"رُخصتِ شباب"

اے جوانی۔ اے حرارت۔ الفراق — اے شباب۔ اے تابِ طاقت۔ الفراق

اے متاعِ بے بہائے زندگی — اے عزیز از جاں امانت۔ الفراق
اے بہارِ جاں فزائے زندگی — اے گراں قیمت بضاعت۔ الفراق

اے کمالِ بخششِ پروردگار — اے خداوندی ودیعت۔ الفراق
اے مکمل تر عطائے کردگار — اے الٰہی ظلِّ رحمت۔ الفراق

اے طلوعِ صبحِ کلفت۔ السّلام — اے شبِ قدرِ مسرّت۔ الفراق
اے شروعِ شغلِ وحشت۔ السّلام — اے سکونِ دل کی راحت۔ الفراق

روزگارِ عزم و ہمّت ہو چکا — اے وفورِ عزم و ہمّت۔ الفراق
اعتبارِ بخت و ہمّت ہو چکا — اے غرورِ بخت و قسمت۔ الفراق

سب نشانِ تاب و طاقت مٹ گیا — اے زمانِ تاب و طاقت۔ الفراق
سب گمانِ استقامت مٹ گیا — اے جہانِ استقامت۔ الفراق

ہر خیالِ عیش سے جی ہٹ گیا — اے خیالِ عیش و عشرت۔ الفراق
ہر ہجومِ لطفِ صحبت چھُٹ گیا — اے ہجومِ لطفِ صحبت۔ الفراق

عاشقانہ حوصلوں کے دن گئے — اے تعشّق۔ اے محبت۔ الفراق
والہانہ مشغلوں کے دن گئے — اے تعلّق۔ اے طبیعت۔ الفراق

الوداع اے شوق و حسرت۔ الوداع — الفراق۔ اے وصل و فرقت۔ الفراق
الوداع۔ اے دردِ اُلفت۔ الوداع — الفراق۔ اے عہدِ فرصت۔ الفراق

اے جوانی۔ اے حبیبِ دلستاں — اے رفیقِ ہر مصیبت۔ الفراق
اے شباب۔ اب تو کہاں اور ہم کہاں — فی امان اللہ رُخصت۔ الفراق

حضرتِ آزاد! بس اب کوچ ہے
یعنی اے حضرت سلامت۔ الفراق

حکیم آزاد انصاری

حیاتِ نَو

فرانسیسی افسانہ نگار ہنری باربوس کا ایک افسانہ

میاں اور بیوی دونوں ضعیف العمر تھے۔

میاں کے نحیف چہرے کو دیکھ کر آسانی سے اندازہ لگایا جا سکتا تھا۔ کہ وہ اپنی پچھلی عمر میں یا تو فوج کا ایک تجربہ کار سپاہی تھا۔ یا کوئی ایک باکمال آرٹسٹ۔

بیوی نے پرانے فیشن کا ایک بوسیدہ لباس زیب تن کر رکھا تھا جس سے پختگیٔ عمر کے آثار ظاہر ہوتے تھے۔

آپس میں ان دونوں کے تعلقات بالکل ایسے ہی تھے۔ جیسے چھوٹی عمر والے مگر ذہین بچوں کے ہوتے ہیں۔

وہ ایک دوسرے کے ساتھ اپنی خوشگوار عادتوں اور چالاکیوں کی وجہ سے ایسے گھُل مل سے گئے تھے جس سے انہیں اپنی بے حس اور بے لطف زندگیوں میں بھی کافی مسرّت اور خوشی حاصل ہو جاتی تھی۔ اگرچہ اخبار بینی کا شوق بڑھاپے میں ان کا واحد شغل تھا۔ اور وہ روزانہ رات کو باری باری اخبار پڑھتے۔ مگر وہ کبھی کسی نئی خبر سے متاثر نہ ہوتے۔ اور ہو بھی کیسے سکتے تھے۔ بڑھاپے کی وجہ سے وہ کچھ اخذ کرنے اور سمجھنے کے بالکل ناقابل اور ناکارہ تھے۔ اگر کوئی بات اُن کے کُند دماغوں پر اثر ڈال سکتی تھی۔ تو وہ صرف یہی روزمرہ کی زندگی کے ڈراؤنے اور ہیبت ناک حوادث اور واقعات ہیں۔ جنہیں سُن کر بعض تو حیرت سے اظہارِ تاسف کر لیتے ہیں۔ اور بعض گہرے سوچوں میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔

نفسیات کی رُو سے اکثر ایسا ہوتا رہا ہے۔ اور آئندہ بھی ضرور یونہی ہوتا رہے گا۔

آج رات بیوی کو اخبار پڑھ کر میاں کو خبریں سنانی تھیں۔ میاں نے لیمپ روشن کیا۔ اور بیوی کے پاس میز پر رکھ دیا۔ اور خود خبریں سُننے کے اشتیاق میں میز کے قریب والی کرسی پر سکڑ کر بیٹھ گیا۔

بیوی نے اخبار اٹھایا اور یہ خبر پڑھی۔ "لوگوں نے اُس نوجوان کی لاش کو کوئیں میں سے نکالا۔ مقتول کے سینے پر گولی کے بے شمار زخم تھے۔ اس افسوس ناک قتل کے واقع ہو جانے سے والدین کی حالت نہائت نازک اور ناقابلِ بیان ہے۔!!"

"آہ۔ بدقسمت انسان!" میاں نے غافلانہ انداز میں صرف یہ رائے زنی کی اور گھبرائی ہوئی آواز میں پوچھا۔ "مقتول کی کیا عمر تھی؟"

بیوی اخبار کی سطروں کو غور سے دیکھنے لگی۔ اور کچھ تامّل سے بولی۔ "اس میں یہ مذکور نہیں"

مگر ٹھیریئے۔۔۔۔ ذرا ٹھیریئے۔۔۔۔ ہاں ہیں۔۔۔۔!!

جین ریکس" مقتول کی عمر بیس سال تھی۔ اور اُس کی شادی بھی ہونے والی تھی!!"

"بیس سال! آہ۔۔۔ جولین کی عمر بھی بیس سال ہی تھی، افسوس!!"

اس کے بعد ایک سکون آمیز خاموشی میں وہ دونوں دنیا بھر کی موتوں کے ساتھ ساتھ نوجوان جولین کی موت پر بھی (جو ان کے ایّامِ جوانی کا دوست تھا) بہت دیر تک افسوس کرتے رہے۔ اور سوچتے رہے۔

پیشانی کو ذرا سنجیدہ بنا کر میاں نے سوال کیا۔ "یہ کب کا واقعہ ہے؟"

"جولین آہ جولین کو مرے ہوئے تقریباً چالیس سال ہو گئے ہوں گے۔" بیوی نے جواب دیا۔

"افسوس!" وہ بولا۔

بعد ازیں بالکل خاموشی تھی۔

مگر جلدی بیوی کے ہونٹوں میں ایک حرکت سی پیدا ہوئی۔ اٹھی اور دردناک لہجے میں پکارنے لگی۔ "جولین آہ جولین"!!

بیوی کو اس ناآشنا اور حیران کن پیرائے میں یہ نام دہراتے ہوئے دیکھ کر میاں سخت متعجب ہوا۔ اور بے چینی سے بولا۔ "تم نے بلا کیوں

رہی ہو؟"

اُس نے اخبار کو میز پر رکھ دیا۔ اور سامنے دیکھنے لگی۔

اس کی آواز میں لغزش تھی، تاہم وہ اِس طرح مخاطب ہوئی

"میں یہ راز آج تم پر ظاہر کر رہی ہوں۔ اور ساتھ ہی اقرار بھی کرتی ہوں.... کہ جولین آہ جولین سے مجھے بے حد محبت تھی۔ اور وہ مجھے بھی بہت چاہتا تھا!!"

"یہ کیا کہ رہی ہو تم!! اُس کو تم سے اور تم کو اُس سے محبت تھی۔ اور میں.... آہ مجھ سے تمہیں.... !!؟"

اس نے کچھ بدحواسی کی سی حالت میں پُر گداز اور پُر خلوص فقرے مُنہ سے کہے۔ "میں تم سے محبت کرتی تھی۔ کرتی ہوں۔ اور ہمیشہ کرتی رہی ہوں۔ مگر کبھی آہ کسی وقت میں اُسے بھی (اس کی موت سے چند سال پہلے) محبت کیا کرتی تھی!!

اُس نے آہستہ سے ایک آہ بھری۔ اس نئے اور عجیب و غریب انکشاف نے اُس کی کمزور حِسوں کو سخت بے چین کر دیا۔ وہ دیر تک تحیّر کے عالم میں رہا!!

"اب ان غیر ضروری باتوں سے فائدہ؟" آخر اُن میں سے ایک خاموش لہجے میں بڑبڑایا۔

"کچھ نہیں!!" دوسری جانب سے جواب آیا۔

اِسی اثنا میں بیوی کے دماغ میں ایک اور بھی ایسا ہی مترادف خیال پیدا ہوا جس سے وہ بالکل بے قابو ہو گئی اور بے اختیار بول اٹھی

"اور تمہیں بھی کیا کسی سے.... آہ کیا تمہاری بھی کوئی محبوبہ تھی!!؟"

اِس سوال سے میاں کی رُوح جوشِ مسرّت سے شگفتہ ہو گئی اور انتہائی خوشی سے متکلمانہ انداز میں بولا "کیوں نہیں.... ہاں میری بھی ایک محبوبہ تھی!!"

بیوی نے متحیر ہو کر کہا: "آہ تم بھی میری ہی طرح مجرم ہو۔ مگر مجھے تو اس کا یقین نہیں آتا!!"

اُن کے درمیان دیر تک ایسی گفتگو ہوتی رہی۔ جیسے کوئی اجنبیوں کے بارے میں بات چیت کرے۔ وہ ایسے ہی نامعلوم معموں کو جاننے کی کوشش کرتے رہے۔

"ہاں تو پھر تمہارے اور جولین کے درمیان ملاقاتیں بھی ہوئی ہوں گی؟"

"ہاں!"

"وہ ملاقاتیں کس جگہ ہوئی تھیں؟"

"مجھے یاد نہیں!!"

"کتنی دفعہ تم آپس میں ملے تھے۔ یہ تو یاد ہو گا؟"

"یُونہی کوئی تین چار بار.... مجھے صرف اتنا یاد ہے۔ کہ ہماری پہلی ملاقات تو کوئی اتنی لمبی بھی نہ تھی!!"

"ہاں تمہاری محبوبہ.... (میں نے اُس کے بارے میں تو تم سے کچھ پوچھا ہی نہیں۔ کیا وہ اب تک زندہ ہے!!؟"

"یقیناً نہیں۔ وہ تو کب کی مر چکی ہو گی!!"

"اچھا یہ بتاؤ۔ کیا وہ خوبصورت بھی تھی؟"

اس سوال پر میاں نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ مگر تھوڑے وقفے کے بعد پھر کھول لیں۔ جس سے ظاہر تھا۔ کہ اُس نے اِس سوال کو چنداں دلچسپ نہ جانا۔

"بلاشبہ...... مجھے ہلکا سا تصور ہے.... مگر وہ بے حد حسین ہوتی اگر وہ زندہ رہتی!! اُس کی موت کے زمانے سے اب تک میں صرف اس کی محبوب تصویر سے اپنے دِل کو بہلاتا رہا ہوں.... مگر اب آہ اب اُس کی تصویر نے اُس کی یاد بھی میرے دل سے بھلا ڈالی!!"

"ہاں مجھے بھی ایسا ہی محسوس ہوتا ہے۔ کہ جولین کی یاد بھی اب میرے دل سے بالکل فراموش ہو چکی ہے!!"

مگر یہ حسین جملہ بھی بیوی کے مُنہ سے بے اختیار نکل پڑا!!

مجھے اس سے کس قدر محبت تھی..... آہ میں اسے کتنا چاہا کرتی اگر........!!؟

"اب تو ہم سب کچھ بھول گئے ہیں دونوں.... کیوں۔

"ہاں ہمارے دماغ میں اب یونہی ایک دُھندلا سا خیال ہے۔ ان قِصّوں کا۔ اور یہ خیال بھی آخر مٹ جائے گا!!"

"تمہاری محبت کتنے عرصہ تک قائم رہی؟"

"یہی ایک بہار کے موسم سے دوسرے تک..... صرف چھ ماہ کا قلیل ترین وقفہ!؟"

اور تمہاری محبت؟!!

"میری محبت کا قیام تو کچھ بھی نہ تھا... صرف ایک ماہ..

...... آہ بیچارہ کتنی جلدی مر گیا!!"

"اور پھر مرنے کے بعد تو تم اسے بالکل بھول گئی ہوں گی؟!"

"نہیں یہ کیسے ہو سکتا تھا۔ کہ میں اُسے بھول جاتی۔"

"میں اسے کبھی نہیں بھولی۔ ذرا ٹھیرو۔ . . . . آہ سنو!!"

"مجھ پر تو اس کی موت کا اتنا گہرا اثر ہوا تھا۔ کہ میں اُس وقت خودکشی کرنے کے لئے تیار ہو گئی تھی!!"

"لیکن اب مجھے یوں محسوس ہوتا ہے۔ کہ یہ میری یادداشت کا اندازہ ہے۔ جو داستان میں تمہیں سنا رہی ہوں!!"

"بعد میں پھر کیا ہوا؟"

"کچھ بھی نہیں۔ ہونا کیا تھا۔ میں تمہاری محبت سے اپنا دل بہلانے لگی۔ اکثر ایسا ہی ہوا کرتا ہے۔ اور ہونا بھی ایسا چاہیئے تھا!!"

وہ اپنی محبت کا راز افشا کرنے کے بعد بہت پشیمان ہوئی۔ اور مایوس چہرہ بنا کر بولی۔ "یہ کیسے ممکن ہو سکتا ہے۔ کہ بعد میں کچھ بھی نہ ہو۔ مجھ پر کچھ بھی اثر نہ پڑے۔ اظہارِ حقیقت بیان کرتے ہوئے بعض اوقات انسان کتنا بیوقوف بن جاتا ہے!!"

"بھلا اس میں بیوقوفی کیا ہے۔ مجھے بھی تو بعد میں اپنی محبوبہ کا خیال جاتا ہی رہا!! انسان کتنا محتاط رہتا ہے ایسے معاملوں میں . . . تمہیں یاد ہو گا۔ جب میں نے تم سے کہا تھا کہ میں لندن جا رہا ہوں!!"

"تو پھر کیا تم اپنی محبوبہ کے ساتھ لندن گئے تھے؟"

"ہاں اُسی کے ساتھ تو میں لندن گیا تھا!!"

اس کی پیشانی پر غصے سے بل پڑ گیا۔ اور وہ جھلا کر بولی "اگر مجھے تمہاری اس چالاکی کا پتہ چل جاتا۔ تو میں کیا کچھ نہ کر بیٹھتی!!؟"

"اگر مجھے تمہارے فریب کا علم ہو جاتا۔ تو میں بھی تم پر تم جانتی ہو۔ کس قدر ناراض ہوتا!!"

"یقیناً" وہ متحمل مزاجی سے بولی "ہم نے ایک دوسرے کو سخت دھوکہ دیا۔ بے حد بے انصافانہ سلوک کیا ایک دوسرے کے ساتھ!!

اس کے بعد وہ دونوں خاموش ہو گئے۔

آخر میاں بولا "اب بہت دیر ہو چکی ہے!!"

رات کے نو بج چکے تھے۔ دونوں کے اعتراف محبت نے رات کا وافر حصہ صرف کر ڈالا تھا!!

دونوں اٹھے۔ کھڑے ہو کر مظلومانہ نگاہوں سے ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے۔

تھوڑے عرصے کے بعد انہیں اس بات کا احساس ہوا کہ وُہ دونوں آپس میں ہم آغوش ہو رہے ہیں!!

میاں دہشت زدہ ہو کر متانت سے بولا "واقعی ہم دونو بہت بچے ہیں کہ ہم نے ایک دوسرے کو اپنی اپنی محبت کا بیان صفائی سے پیش کر دیا!!"

بیوی بھی رضامندی کا اظہار کرتی ہوئی بولی "ہم نے بہت خوب کیا۔ اب ہمارے لئے اس کا اثر بہت ہی خوشگوار ثابت ہو گا!!"

دونوں خواب کے کمرے میں گئے۔ لباس تبدیل کرتے ہوئے بیوی پھر نقادانہ انداز میں بولی "دیکھو! ہم نے اپنا اپنا راز کتنے عرصے تک ایک دوسرے سے چھپائے رکھا۔ ہم نے ایک دوسرے کے ساتھ جابرانہ اور بے رحمانہ سلوک کیا۔ اور صرف یہی وجہ ہے۔ کہ ہماری زندگیاں بھی ایک دوسرے سے بالکل متضاد اور مختلف ہیں۔

ہم اپنے آپ کو روئے زمین کی خوش نصیب مخلوق تصوّر کرتے تھے۔ مگر ہمارا یہ خیال کتنا غلط اور کس قدر پُرفریب تھا۔ دیکھا۔ اس انقلابِ عظیم نے کتنی شدید ضرب پہنچائی ہمارے تعلقاتِ باہمی کو!!"

بعد ازاں وہ اپنے اپنے بستر پر لیٹ گئے۔ میز پر پڑے ہوئے لمپ کی ہلکی ہلکی روشنی میں سوچتے رہے۔ پشیمان ہوتے رہے۔ اور انسانی جھوٹ کی نفسیات پر ایک آزادانہ بحث کرتے رہے۔ آنے والی نیند کے مسحور کن انتظار میں!!

اُنہیں تمام رات نیند نہ آئی۔ آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ ہمدردی اور غمخواری کا انہیں اس قدر خیال تھا۔ کہ آدھی رات کے وقت وہ اکٹھے چارپائیوں پر سے اُٹھے بیک وقت دھیمی دھیمی صداؤں میں ایک دوسرے کو پکارنے لگے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا۔ کہ وہ ایک دوسرے کی مدد کے لئے کمال بے چینی سے سسکیاں بھر رہے ہیں!!

اُن کی بجھو بنیاز سے لبریز آنکھیں ایک دوسرے کی طرف دیکھ دیکھ کر رحم کی درخواست کر رہی تھیں۔ اور اُن میں نئی زندگی کے آنسو اُمڈ آئے تھے۔

پارینہ اور گزشتہ قصوں کی یاد سے قطع نظر . . . یہ نیا انقلاب اپنے اندر کتنی سرور انگیز دلفریبیاں اور کتنے کیف آور نشوں کے احساسات لئے ہوئے ہے!! وہ کسی قدر لکنت سے بولی "مگر آہ۔ ہمیں اپنا اپنا راز بیان کرنے کیلئے نئے سرے سے اپنی زندگیوں کی تخلیق نہیں کرنی چاہیئے تھی!!"

عظیم قریشی

ظہورِ نُور

یہ کِس کا نور فروزاں جبینِ ماہ میں ہے — یہ کِس کی زلفِ معنبر شبِ سیاہ میں ہے

یہ کِس کا حُسنِ جہاں سوز آفتاب میں ہے — یہ کون جلوہ فشاں لالہ و گلاب میں ہے

یہ کِس کا خندۂ معصوم رُوئے صبح میں ہے — یہ کِس کا جلوہ رواں آبجوئے صبح میں ہے

گلوں میں رنگ ہے کِس کا! صبا میں بُو کِس کی — نہاں ہے سینۂ بُلبُل میں ہاؤ ہُو کِس کی!

یہ کِس کی بزمِ طرب آسماں پہ برپا ہے — یہ کون محفلِ انجم میں نغمہ پیرا ہے!

یہ کِس کا نغمۂ شیریں ہے آبشاروں میں — یہ کِس کی سطوت و تمکیں ہے کوہساروں میں

چراغِ حسن سے بزمِ حیات روشن ہے
ضیائے عشق سے یہ کائنات روشن ہے

یہ کِس کا نور میری رُوح میں جھلکتا ہے — یہ کِس شراب سے ساغر مرا چھلکتا ہے

یہ میرا پیکرِ خاکی ہے نور در آغوش — ہے سنگریزۂ دِل برقِ طور در آغوش

یہ کِس کے نور سے روشن ہوئی نگاہ مری — کمندِ ہر دو جہاں ہو گئی نگاہ مری

یہ کِس کا نور جبیں میں مری چمکتا ہے — کہ جبرئیل بھی حیرت سے اس کو تکتا ہے

یہ میرا نغمۂ رنگیں ہے میکدہ بکنار — نوائے بربطِ کون و مکاں ہے جس پہ نثار

یہ میرے سینہ میں دل ہے کہ نور کی دُنیا — سرود و رقص کی، ذوق و سرور کی دُنیا

تلاشِ طور مجھے کیوں ہو رشکِ طور ہوں میں
ازل کے نور کا احسن تریں ظہور ہوں میں

اثر صہبائی

آخری دِن

میں اس وقت بائیس برس کی تھی۔ اور شہر وائنا کی ہر مجلس میں میرے حسن و جمال کا چرچا تھا۔

سرما کے اواخر کا ذکر ہے۔ کہ ایک دن مجھے ایک خوش پوشش شریف زادے نے بلا بھیجا اور کہا۔ "کیا آپ تھوڑی دیر کے لئے تنہائی میں میرے ساتھ بات کر سکتی ہیں؟" میں نے اس کی درخواست قبول کرلی۔ اس نے کہا:—

"میری ایک لڑکی ہے۔ جس سے مجھے بے حد محبت ہے۔ وُہ بُری طرح بیمار ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ اس کی زندگی اور طاقت کو دوبارہ کارفرما کردوں۔ اس مقصد کے لئے میں ہر طرف کا چکر کاٹ رہا ہوں۔ تاکہ کوئی شخص مجھے اپنی جوانی کے چند سال مول یا عاریتہً دے دے۔ اگر تم مجھے ایک سال قرض کے طور پر دے دو۔ تو میں ایک ایک دن کرکے اسے موت سے پہلے تمہیں واپس کردوں گا۔ جب تم عمر کی بائیسویں منزل طے کرلوگی تو بجائے تیئیسویں سال کے تم چوبیسویں سال میں قدم رکھوگی۔ تم اپنی جوانی کی تروتازگی کی وجہ سے اس ایک سال کے خلا کو بمشکل محسوس کرسکوگی یقین جانو میں تمہارے ۳۶۵ دن دو دو تین تین کرکے آخری دن تک تمہیں واپس کردوں گا۔ اس طرح بڑھاپے میں بھی تم چوبیسویں سال کی سی جوانی کا لطف اٹھاتی رہوگی۔ تم یہ نہ سمجھنا کہ میں تم سے مذاق کر رہا ہوں۔ میں ایک غریب آدمی ہوں اور میں نے خدا سے باخلاص دعا کی تھی کہ مجھے وہ نعمت ملے جو آج تک کسی کے قبضے میں نہ آئی ہو۔ اس سے پہلے میں تین سال کا عرصہ جمع کرنے میں کامیاب ہوچکا ہوں۔ مگر ابھی مجھے بہت سے سالوں کی ضرورت ہے۔ ایک سال تم دیدو اور اطمینان رکھو کہ تمہیں اس فراخدلی سے کوئی کوفت نہیں ہوگی۔"

میں ہمیشہ ایسے عجیب و غریب واقعات سے دوچار ہوتی رہی ہوں۔ اس لئے میں یہ حیرت انگیز قرضہ دینے پر تیار ہوگئی۔ اور چند دنوں میں بقدر ایک سال کے میری موجودہ عمر میں اضافہ ہوگیا۔ شائد ہی کسی نے اس اضافے کو محسوس کیا ہوگا۔ چالیس سال تک مجھے اپنا وہ سال واپس لینے کی ضرورت نہ پڑی جو میں نے بطور قرض دے رکھا تھا۔ اور جو ابھی تمام کا تمام مجھے واجب الوصول تھا۔

بوڑھے شریف زادے نے اپنا پتہ تمسک نامے کے ساتھ ہی منسلک کردیا۔ اس نے یہ بھی کہہ دیا تھا کہ اگر تمہیں ایک دو دنوں یا ایک ہفتہ کی ضرورت پڑے تو ایک مہینہ پہلے مجھے اطلاع دیدینا تاکہ مقررہ وقت پر تم کو مطلوبہ ایام مل سکیں۔

چالیس سال کے بعد میری جوانی ڈھلنے لگی۔ میں ایک قلعے میں جو میرے خاندان کی ملکیت تھا۔ اقامت گزیں ہوگئی۔ اور وائنا میں صرف ایک یا دو بار سال میں جایا کرتی تھی۔ میں بوڑھے قرضدار کو ایک مہینہ قبل از استفادہ لکھ دیا کرتی تھی۔ اور بائیسویں سال کی سی جوانی کی بہار لے کر شہر کے بڑے بڑے گھرانوں میں چلی جایا کرتی تھی۔ اور جن لوگوں نے میری جوانی کا انحطاط دیکھا تھا۔ ان کے لئے میں ایک معما بن جاتی تھی۔ فی الحقیقت وہ لمحے بڑے مسرت انگیز تھے جبکہ شام کے وقت میں بڑھاپے کے باعث کسلمند نظر آتی تھی۔ اور صبح اٹھ کر شبک رفتار ہرن کی طرح قلانچیں بھرتی پھرتی تھی۔ اس وقت میرے چہرے کے تمام شکن دُور ہوجاتے۔ میرا جسم سڈول نکل آتا۔ بال سنہری ہوجاتے۔ اور ہونٹ سُرخ۔ ——— اتنے سُرخ کہ خود میرا انہیں چومنے کو جی چاہتا! اس وقت وائنا کے لوگ جو میرے حسن کے جال میں گرفتار ہوچکے تھے۔ میرے گرد جمع ہوجاتے اور میرے اچانک تبدیل ہوجانے کو جادو اور سحر پر محمول کرتے۔ لیکن انہیں اصلی واقعہ کی قطعاً خبر نہ تھی۔

جب میرا ٹھیکہ ختم ہونے کو آیا۔ تو میں نے اپنے آپ کو اسی قلعے میں بند کردیا۔ وہاں کسی کو بھی ملاقات کی اجازت نہ تھی۔ مگر ایک دن ایک جرمن افسر جو وائنا میں میرے دامِ حسن میں پھنس چکا تھا۔ کسی پُراسرار طریق سے میرے کمرے میں داخل ہوگیا۔ مجھے معلوم نہیں یہ کیسے ہوا! مجھے صورت بدلی ہوئی دیکھ کر اس کے حواس بجا نہ رہے۔ اس کے بعد کسی نے بھی میرے محبس میں آنے کی جرات نہ کی۔ میں کبھی کبھی اپنے واجب الوصول دنوں کے ذریعے سے جوانی کی بہار دیکھ لیتی تھی جس سے میرے رو بہ انحطاط شباب کا تسلسل منقطع ہوجاتا تھا۔ تم میری اس عجیب و غریب زندگی کا تصور نہیں کرسکتے۔ جو میں نے اس طرح گزاری ——— پژمردگی اور افسردگی

کا طویل زمانہ جس میں ایک دو دنوں کے لئے جوانی عود کر آتی تھی۔

غرضکہ یہ ۳۶۵ دن مجھے لاانتہا معلوم ہوتے تھے۔ اکثر میں دنوں کی بقیہ تعداد سے بے نیاز ہو کر بوڑھے قرضدار سے مطالبہ کیا کرتی تھی۔ مگر وہ حساب کا پکا تھا!

ایک دن میں اس کے گھر گئی۔ حساب کی کاپی دیکھنے پر مجھے معلوم ہوا کہ صرف میں ہی ایسی عورت نہیں جس کے ساتھ اس نے ایسا ٹھیکہ کر رکھا ہے بلکہ اور بھی ہیں۔ وہاں میں نے اس کی لڑکی بھی دیکھی۔ اس کا رنگ زرد۔ اور چہرہ موت آفریں تھا! اس کے گرد پھول ہی پھول جمع تھے۔

میں نے کبھی اس امر کا اندازہ نہیں لگایا تھا کہ وہ کہاں سے زندگی مانگ کر مقررہ دن پر ادا کر دیتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ وہ نئے آدمیوں سے اُدھار لے کر پُرانے قرضخواہوں کو دے دیتا ہوگا۔ میں حیران ہوا کرتی تھی کہ وہ کون عورتیں ہیں۔ جو اسے زندگی کے محدود ایام میں قرض دے دیتی ہیں۔ ۔ ۔ ۔ میں ان میں سے کسی ایک سے ملنا چاہتی تھی۔ مگر اس میں میں کامیاب نہ ہو سکی۔ وہ بہت ہی عجیب و غریب انسان تھا۔ اور اس کام کو نہائت حسُن و خوبی سے انجام دیتا تھا۔

تم اُس کوفت کا تصور نہیں کر سکتے۔ جو مجھے اس وقت پہنچی جب اس نے نہائت متانت کے ساتھ مجھے بتایا کہ اب صرف گیارہ دن اس کے ذمے باقی رہ گئے ہیں۔ سال بھر میں نے اس سے مطالبہ نہ کیا تھا۔ ایک دن میرے دل میں خیال آیا کہ اسے باقی ماندہ دنوں کے لئے ایک ہی دفعہ لکھ دوں تاکہ بار بار لکھنے کی زحمت گوارا نہ کرنی پڑے۔ تمہیں معلوم ہے۔ میں نے ایسا کیوں کیا؟ لو سنو! جوں جوں میری موجودہ عمر اور بائیسویں سال کے درمیان کا عرصہ زیادہ ہوتا گیا۔ میری جوانی عود کر آنے کا امکان بھی جاتا رہا۔ اس لئے میں چاہتی تھی کہ جلد از جلد ان گیارہ دنوں کو طلب کر کے پھر ایک بار جوانی کی بہار سے لطف اندوز ہو سکوں۔

اب میرے تمام ایام ختم ہونے والے تھے۔ اور میرا سارا حساب بیباق ہو جاتا تھا۔ ذرا سوچو تو! ایک دن باقی رہ گیا تھا۔ اس کے بعد مستقل طور پر میں بڑھاپے کی ندمیں آ چکی تھی ـــــ صرف ایک دن نورانیت کا۔ اور پھر سردی اور ابدی تاریکی! مجھے معلوم نہ تھا کہ اس ایک دن میں کیا کیا ظہور پذیر ہوگا؟ مگر میں اپنا آخری دن کب طلب کروں؟ کیا میں اسے چھوڑ دوں؟ یہ خیال تھا۔ جو ہر وقت میرے دل میں سمایا رہتا تھا۔ تین سال سے میں نے جوانی کا عارضی لطف نہیں اٹھایا تھا مجھے شائد ہی اب کوئی دُنیا میں جانتا ہوگا۔

اب میں ایک ایسے شخص کی ضرورت محسوس کرتی تھی جو میری والہانہ الفت کا دلدادہ ہو۔ آہ میرا اشکن آلود چہرہ آخری بار شگفتہ ہوگا اور سوکھے ہوئے۔ نفرت آفریں ہونٹ آخری بار گلاب کی طرح سُرخ ہوں گے ـــــ آخری بار، آخری بوسے کے لئے!

یہ کہکر غریب شہزادی کی آنکھوں سے آنسوؤں کا سیلاب امڈ آیا۔ یہ رقت انگیز منظر دیکھ کر میرے دل میں خیال آیا کہ میں اس پیکر یاس و حرماں کو تسلی دوں۔ میں اس قابل پرستش عورت کے پاؤں پر گر پڑا۔ اور اُسے یقین دلایا۔ کہ میں ایک ایسا انسان ہوں جو تہ دل سے تمہارا طالب ہے۔ اور اس سے درخواست کی کہ وہ اپنے حسُن کا "آخری دن" میرے لئے وقف کر دے۔

ان اطمینان بخش الفاظ سے اس کی ڈھارس بندھ گئی۔ اور اس نے کہا "ایک ماہ کے بعد تم میرے حسُن سے لطف اندوز ہو سکتے ہو ـــــ صرف ایک دن کے لئے!" ہم نے فیصلہ کر لیا کہ اسی پرانے گھر میں ملیں گے۔ اس کے بعد میں اُسے خدا حافظ کہ کر چلا گیا۔

میں نے اپنی محبوبہ سے وعدہ کر رکھا تھا کہ مقررہ دن سے پہلے اُسے نہ دیکھوں گا اور میں نے اپنا وعدہ بہ تمام و کمال پورا کیا۔ بالآخر وہ دن آ پہنچا۔ شام ہو گئی۔ میں نے اس کے گھر کا راستہ لیا۔ دور ہی سے گھر کی کھڑکیاں نظر آ رہی تھیں تھوڑی دیر کے بعد میں وہاں پہنچ گیا۔ گھر کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ اور گیلری پھولوں سے لدی پڑی تھی۔ میں اندر داخل ہو گیا۔ وہاں بیشمار کافوری شمعیں، خیرہ کن روشنی سے کمرے کو منور کر رہی تھیں۔

مجھے ہدائت کی گئی تھی کہ میں تا حکم ثانی منتظر کھڑا رہوں۔ میں نے بہت انتظار کیا مگر کوئی فرد بشر نمودار نہ ہوا۔ ایک گھنٹے کے صبر آزما انتظار کے بعد میں کھانے کے کمرے کی طرف چل پڑا۔ وہاں انواع و اقسام کے پھلوں اور پھولوں کی طشتریاں مزین تھیں آخرکار بڑی جرائت کر کے میں شہزادی کے کمرے تک جا پہنچا۔ میں نے دروازے پر دستک دی۔ مگر کوئی جواب نہ ملا۔ اس پر میں نے حوصلے سے کام لے کر اور عاشقوں کی طرح آداب مجلس سے بے نیاز ہو کر دہلیز پر قدم رکھا۔ اور اندر داخل ہو گیا۔

کمرے میں خوبصورت کپڑے پریشان حالت میں پڑے تھے۔ چند دھیمی دھیمی شمعیں فرش پر بکھری پڑی تھیں۔ شہزادی آئینے کے سامنے بانوؤں والی کرسی پر جلوہ افروز تھی۔ وہ اس وقت خوبصورت ترین لباس زیب تن کئے ہوئے تھی۔ میں نے آواز دی مگر کوئی جواب نہ ملا۔ میں اس کے پاس گیا مگر وہ نہ ملی۔ میں نے دیکھا کہ اس کا چہرہ زرد پڑ چکا ہے۔ میں نے اپنا ہاتھ اس کے مُنہ پر رکھا مگر سانس کی آمد و رفت بند تھی اور دل ساکن و جامد تھا!

آہ شہزادی مر چکی تھی۔

اس کے پاس ایک خط پڑا تھا جو شکستہ الفاظ میں لکھا ہوا تھا:۔

میری پیاری شہزادی!

مجھے نہائت ہی افسوس ہے کہ میں تمہارا آخری واجب الادا دن مقررہ وقت پر واپس نہیں دے سکا کسی عورت نے بھی میری حیرت انگیز کہانی پر اعتبار کرتے ہوئے مجھے زندگی کا قلیل ترین حصہ عاریۃً نہیں دیا۔ اس وجہ سے میری لڑکی کی زندگی خطرے میں ہے میں ہر ممکن ذریعے سے کوشش کرونگا اور تمہیں اپنی کامیابی اور ناکامی سے اطلاع دُونگا۔ میں آخری وقت تک تمہاری خوشنودی کا طالب ہوں!

(تمہارا احسان مند)

(گیووانی پاپیتی)

طاہرہ قریشی

جہانِ عشق کی دیوالی

جہانِ عشق میں غم لے کے آئی دیوالی
چراغِ داغ جلا کر منائی دیوالی

ہزار بار تماشا کیا چراغاں کا
سماں کچھ اور ہی ہے داغہائے خنداں کا

یہ داغِ دل ہیں کہ آٹھوں پہر چمکتے ہیں
یہ وہ شرار ہیں جو رات بھر چمکتے ہیں

جگر کے خون کا روغن بنائے جاتے ہیں
چراغ سوزِ محبت جلائے جاتے ہیں

مجال کیا کہ دلِ بے قرار سو جائے
وہ دل ہی کیا جو شبِ انتظار سو جائے

جو پھول بن کے اُڑے داغِ دل بہاروں میں
تڑپ رہے ہیں وہ جگنو سے سبزہ زاروں میں

تحیّرات میں ہے حیرتِ نظارہ گُم
تجلّیات میں ہے غرق محفلِ انجم

کسی کی یاد میں مجبوریوں سے رو نہ سکے
یہ داغ وہ ہیں جنہیں آنسوؤں سے دھو نہ سکے

مٹیں جو آہ سے وہ داغِ دل کے داغ نہیں
ہوائیں جن کو بجھا دیں یہ وہ چراغ نہیں

فروغِ حسنِ ازل دیکھ دل کے داغوں میں
چراغِ طور کا پرتو ہے ان چراغوں میں

رام جوایا خنداںؔ

وِنڈسر محل کے بھُوت

ونڈسر محل کی خوشنما فلک بوس عمارت، جو مغربی صناعی کا اعلیٰ ترین نمونہ ہے۔ انگلستان کے سرسبز و شاداب درختوں کے جاذب نظر جھنڈ میں واقع ہے۔ محل کے احاطے میں رنگ رنگ کے نازک حسین پھولوں کے تختے ہیں۔ اُن پر شبنم کے آب گوں قطرے، آفتابِ سحر کی سکون آفریں طلعت پاشیوں سے چمکدار موتی کی طرح منظر نواز ہوتے ہیں۔ دُور دُور تک طیور، دفورِ مسرت و انبساط میں ترانہ سنجی کرتے۔ حمدِ الٰہی کے گیت آور راگ الاپتے اور اپنی ہی پُرترنم آواز پر سر دُھنتے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے۔ کہ پرندوں کی ہلکی سُریلی لذت آفریں موسیقی سے ساری فضا معمور ہے۔ قدرت کے لاجوردی، گوناگوں مناظر سے لذت گیر ہونے والوں کے لئے اس سے زیادہ دلکش حسین اور رُوح افزا منظر صفحۂ گیتی پر شاذ ہی ہو۔

(۱) ہیرن کا بھُوت

ملکۂ الزبتھ کے سریر آرائے سلطنت ہونے سے چند سال پیشتر "ہیرن" نامی شکاری نے خودکشی کر لی۔ اس نے طبعی موت کا کیوں انتظار نہیں کیا۔ یہ ہم نہیں بتا سکتے۔ ایک روز کا واقعہ ہے کہ "ارل آف شوری" تنہا ماہتاب کی سمن زار، نزہت فریب روشنی میں محل سے واپس جا رہا تھا۔ جنگل میں ہر طرف سکوت مُبہم طاری تھا۔ سنہری درختوں کے ہیبت سائے خانۂ کالبد میں کپکپی پیدا کر رہے تھے کہ یکایک بلوط کے ایک درخت کے نیچے لالہ کے آتشیں پھولوں کے فرحت زا تختے کے پاس اس کو ہیرن کا بھوت دکھائی دیا۔ جس کی شکل بڑی حد تک انسان کی سی تھی۔ سر پر سینگدار (بارہ سنگے کی مانند) ٹوپی تھی جس میں سے عجیب و غریب روشنی جگنو کی چمک کی طرح ایک ایک لمحے کے وقفے سے پیدا ہو کر غائب ہو جاتی تھی۔ وہ گھوڑے پر سوار تھا۔ شوری کو دیکھ کر اُس نے ایک خوفناک قہقہہ لگایا جو وحشت آفریں متنوم و مسموم فضا میں جذب ہو گیا۔ پھر اُس نے چیخ مار کر رونا شروع کیا۔ اور نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ اس روح فرسا واردات سے بدحواس ہو کر شوری نے گھوڑے کو ایڑ لگائی۔ اور ساکنانِ محل سے سارا واقعہ من وعن کہہ سنایا۔ کئی روز بعد "شوری" اور "ڈیوک آف رچمنڈ" بھوت کی تلاش میں نکلے کہا جاتا ہے کہ دُور سے ہیرن کا بھُوت اسی حالت میں دوبارہ نظر آیا۔

تختِ انگلستان پر "ملکہ الزبتھ" متمکن تھیں۔ یہ خبر جب اُس کے گوش زد ہوئی۔ تو اُس نے شکسپیئر کو اس واقعہ کا ایک ڈرامہ تیار کرنے کا حکم دیا۔ نفسِ معلومات کا فقدان تھا۔ اس لئے شکسپیئر نے اپنے جادو نگار قلم سے مصنوعی بیل بوٹے اتار کر ایک ہوش ربا۔ دل خوش کن مرقع (MERRY WIVES OF WINDSOR) بارگاہ الزبتھ میں نذر کیا۔ جب ڈرامہ اسٹیج ہوا تو دیکھنے والوں کی جو بھوت پریت کے قائل نہیں تھے۔ خوف و دہشت سے زبان خشک ہو گئی۔ تھیئٹر میں موت کی سی خاموشی طاری تھی۔ گویا سب کو سانپ سونگھ گیا تھا۔

الزبتھ کا چراغِ حیات گُل ہو گیا۔ کئی اور بادشاہ تختِ سلطنت پر جلوہ افروز ہوئے۔ اور چل بسے۔ مگر "ہیرن" کا مہیب بھُوت گھوڑے پر سوار محل کے سامنے ہر روز نظر آتا رہا۔ جس درخت کے نیچے اس نے موت کا تلخ جام نوش کیا تھا۔ پرانا اور بے برگ و بار ہونے کی وجہ سے بحکمِ جارج سوم کاٹ ڈالا گیا۔ اور بھُوت غائب ہو گیا۔ ۱۸۶۳ء میں "ملکۂ وکٹوریہ" نے ایک درخت لگوایا۔ ایڈورڈ کے حکم سے اُسی مقام پر جہاں اُس نے جانِ شیریں نذرِ اجل کی تھی۔ دوسرا درخت بویا گیا۔ تو "ہیرن کا بھُوت" دوبارہ نظر آنے لگا۔ لیکن اس کی شکل و صورت میں نمایاں تبدیلی ہو چکی تھی۔ وہ ہر سال اب بھی کسی نہ کسی کو درشن دے جاتا ہے۔

(۲) جارج سوم کا بھُوت

جارج سوم کو علمِ موسیقی میں بڑی دستگاہ تھی۔ خاص کر ارغون بجانے میں اپنی آپ نظیر تھا۔ وہ مضراب ارغون سے ایسے دلکش اور

دلآویز راگ پیدا کرتا تھا۔ کہ سننے والے وجد کرنے لگتے تھے۔ اور ساری فضا سرچشمۂ موسیقی معلوم ہونے لگتی تھی۔ ہے یہ کہ "جارج" ایک عرصے تک علیل رہا۔ پھر کاروبار سلطنت میں انہماک و مصروفیت کی وجہ سے اُس کی قوتِ ادراک میں خلل واقع ہوگیا۔ امرائے دربار نے مشورہ کر کے اس کو محل کے بالائی حصے کے کمرے میں نذربند کردیا۔ جہاں سے وہ دریائے ٹیمز کے فردوس نظر منظر ہرے بھرے سبزہ زار اور گوناگوں پھولوں کی دلکش اور خوبصورت کیاریوں سے لذت گیر ہوسکتا تھا۔

جارج سوم کے نشانۂ پیک اجل ہونے کے چند سال بعد محل کے محافظ سپاہی کو جب کہ وہ ٹہل رہا تھا "جارج" کا خوفناک بھوت نظر پڑا جو اس کو سلام کر رہا تھا۔ سپاہی بدحواس ہوکر اپنے ساتھیوں سے جا ملا۔ اور شہر بھر میں اس واقعے کی دھوم مچ گئی۔

(۳) ہنری ہشتم کا بھوت

جب آفتاب کی نورانی شعاعوں پر ظلمتِ شب غالب آتی ہے اور تمام پرند اور چوپائے استراحت کرنے کے لئے اپنے اپنے نشیمن کی راہ لیتے ہیں۔ تو ہنری ہشتم اور اس کی ماہ پارہ شریکِ حیات کی غم انگیز آوازیں فضا کو رنج و حسرت سے معمور کر دیتی ہیں۔ عام طور پر مشہور ہے کہ "این بولین اور ہنری" میں ناجائز تعلقات تھے جس کا نتیجہ "ملکہ الزبتھ" ہے۔ اور اُن کے بھوت اپنی سیاہ کاریوں پر نادم اور پشیمان ہوکر خدا سے ہر شب دردناک آواز میں عفو کی التجائیں کرتے ہیں۔ وغیرہ۔ وغیرہ۔ اُن کے بھوت بھی آج تک ونڈسر محل کے بالائی حصے پر اکثر و بیشتر دکھائی دیتے ہیں۔

(۴) ملکہ الزبتھ کا بھوت

رات نہائت تاریک تھی۔ بادل گرج رہے تھے۔ اور موسلا دھار بارش ہورہی تھی۔ محل کے کتب خانے کا مہتمم کسی ضرورت سے "دارالمطالعہ" میں گیا۔ بجلی کی روشنی سے سارا کمرہ جگمگا رہا تھا۔ الماری کے پاس ایک حسین و جمیل عورت بیش قیمت لباس زیب تن کئے کھڑی کتابوں کی ورق گردانی میں مصروف تھی۔ اُس کی آنکھیں غیر معمولی طور پر روشن تھیں۔ اُس نے بدحواس مہتمم پر ایک اچٹتی نظر ڈال کر زیرِ لب تبسم کیا۔ اور روپوش ہوگئی۔ مہتمم نے حلف اٹھا کر کہا۔ کہ وہ ملکہ الزبتھ کا بھوت تھا۔ جو کتاب خانے میں دکھائی دیا۔ جو آگے بھی کبھی کبھی نظر آیا کرتا ہے۔

(۵) ملازمہ کا بھوت

ایک نوجوان جس کے اعضا سڈول، متناسب اور مضبوط تھے۔ "ونڈسر محل" کی محافظت پر مامور کیا گیا تھا۔ اُس کے حاشیۂ خیال میں کبھی بھوت کا وجود نہ تھا۔ اور نہ کبھی ونڈسر محل کے بھوتوں کے حالات اُس کے گوش گزار ہوئے تھے۔ جب وہ رات کو دیوانخانے میں بیٹھا کسی کام میں مصروف تھا۔ محل کے زیریں حصے سے کسی کے رونے کی آواز آئی۔ اُس نے دروازہ کھول کر آواز کا تعاقب کیا۔ بڑی تلاش و تجسس کے بعد وہ ایک کمرے پر پہنچا جس میں سے صدائے گریہ بلند تھی۔ وہ کمرے میں داخل ہوا۔ اس کے جسم کا ہر بُن مُو کھڑا ہوگیا۔ اور دل بلیوں اچھلنے لگا۔ اُس نے روشنی کا بٹن دبایا۔ بجلی کی روشنی میں کمرے کی ہر شے صاف طور پر نمایاں تھی۔ وہاں کوئی ہستی موجود نہیں تھی۔ دوسرے دن صبح کو جب اُس کی اطلاع دی گئی۔ تو کمرے کا بطور خاص معائنہ کیا گیا۔ کمرے کی تمام چیزیں بے ترتیبی سے پڑی ہوئی تھیں۔ ایک پلنگ تھا۔ اور اُس پر بستر خون آلود۔ کئی روز کی تحقیق و تفتیش کے بعد معلوم ہوا۔ کہ دو یا تین سال پہلے ایک سنگ دل ظالم ملازم اپنی ماہ وش بیوی کو کسی وجہ سے قتل کرکے فرار ہوگیا۔ مردہ جسم تو سپرد خاک کیا گیا۔ لیکن خون آلود بستر کمرے ہی میں پڑا رہا۔ یہ اُسی حسرت نصیب عورت کا بھوت ہے۔ جو ہر شب اپنی قسمت پر آٹھ آٹھ آنسو بہایا کرتی ہے۔ کمرے کو صاف کرا دیا گیا۔ اور وہ بھوت غائب ہوگیا۔ آپ بھوت پریت کے قائل ہوں یا نہ ہوں۔ یہ سچی چلتی پھرتی تصویریں ہیں۔ محل ونڈسر کی جو عام طور پر مشہور ہے۔ کہ ہر شب نظر آتی ہیں۔ ان کے علاوہ محل کے مختلف حصوں میں کئی ایک غیر معروف بھوت ہیں۔ جو میں نے طوالت کے خیال سے نظر انداز کر دیئے ہیں۔

سیّد مہدی حسین

کافر گھٹائیں

ایک مہجورِ محبت کی نگاہ میں

یہ کافر گھٹائیں، یہ کافر گھٹائیں
نظر میں سمائیں تو کیونکر سمائیں
کہیں اور برسیں کہیں اور جائیں
مناسب یہی ہے نہ مجھ کو ستائیں
بغیر اُن کے شعلے ہیں ٹھنڈی ہوائیں
کہاں اُن کو ڈھونڈیں جو وہ یاد آئیں

مری رُوح گہوارۂ رنج و غم ہے
نہ اس پر نئے اور نشتر چلائیں
گھٹائیں جو ہمدرد ہیں تو خدارا
یہ پیغامِ غم میرا اُن کو سنائیں

"کہ اے کائناتِ محبت کی دیوی
ترے ہجر کا بار کب تک اٹھائیں"
"خدا مہرباں ہے، نہ تو مہرباں ہے
کہاں اپنی روداد غم لے کے جائیں"
"مگر ہاں جسے تو نے بسرا دیا ہے
تجھے یاد وہ دورِ ماضی دلائیں"
"وہ قربت تری، وہ نشاطِ مکمل
نہیں بات ایسی جسے بھول پائیں"
"وہ نغمے ترے، وہ ترنم کی موجیں
فرشتے جو سن پائیں تو لوٹ جائیں"
"وہ تیری نگاہوں کا کافر تبسم
وہ تیرے تبسم کی رنگیں ادائیں"
"وہ خوشبو، تری مست دوشیزگی کی
وہ کہنا ترا مجھ سے "بیخود بنائیں""
"وہ اکثر ترا میرے ہمراہ چلنا
وہ تیرے تنفس کی خوشبو ہوائیں"
"وہ اکثر ترا روٹھ کر مجھ سے کہنا
ہمیں تم مناؤ، تمہیں ہم منائیں"
"جدا تھی زمانے سے دنیا ہماری
پریمی ہوائیں، اچھوتی فضائیں"
"مگر آہ یہ انقلابِ زمانہ
کہ اب ہیں وفاؤں کے بدلے جفائیں"

"نہ تو ہے میسر، نہ تیری معیت
مرا دل ہے اور دو جہاں کی بلائیں"
"ہے اک بیکسی جز و روحِ پریشاں
کہاں تک تجھے حال اپنا سنائیں"
"وفورِ غم و رنج سے گھُل رہے ہیں
یہ ہے آرزو اپنی ہستی مٹائیں"

گھٹائیں وہاں جائیں بن کر پیامی
یہ "روداد" رو رو کے اُن کو سنائیں
یہ "روداد" سن کر جو وہ مہرباں ہوں
انہیں میرے گھر اپنے ہمراہ لائیں
جو اے کاش یہ کامرانی ہو ممکن
مرا دکھ سے لبریز دل دے دعائیں
وہی پھر ہو نظارۂ حسنِ رعنا
وہی پھر ہوں سرمست و بیخود ہوائیں
وہی پھر ہوں اُن کے تبسم کی موجیں
وہی پھر ہوں سرشار میری وفائیں
پھر اک روز ہم محوِ سیرِ چمن ہوں
گھٹاؤں کے آنے کی مانگیں دعائیں
ادھر محو دونوں ہوں اپنی دعا میں
اُدھر جھوم کر آئیں کالی گھٹائیں

مسلط ہوں یوں بدلیاں بام و در پر
ہنسے ہر کلی، پھول بھی مسکرائیں
کچھ اس طرح گرجیں، کچھ اس طرح برسیں
دھڑکنے لگے اُن کا دل، سہم جائیں
گھٹائیں مچاتی رہیں شور پیہم
ہنسائیں مجھے، اور اُن کو ستائیں
غرض عشرتِ زندگی ہو میسر
حقیقت میں برسات کے لطف آئیں

بڑے لطف سے پھر تو ساون منائیں
کہوں میں کہ "وہ آئیں کافر گھٹائیں"

منظر صدیقی، اکبرآبادی

افسونِ حکمت

میں اور میری بیوی اٹلی کے شمال میں ایک چھوٹے سے قصبے میں ٹھہرے ہوئے تھے۔ ایک دن سہ پہر کو جبکہ موسم خوش گوار تھا ہم دونوں ایک چھ سات میل لمبی سیر پر نکل گئے۔ تاکہ چند ایک پہاڑیوں کے پیچھے جو اس قصبہ کے مغرب میں حائل تھیں۔ غروب آفتاب کا دلفریب منظر دیکھیں ہمارے راستے کا اکثر حصہ ایک پتھریلی مگر ہموار شاہراہ پر مشتمل تھا جو آخر میں تنگ راستوں کے ایک سلسلے میں منقسم ہو جاتا تھا۔ ان راستوں کے دونوں طرف بعض جگہ لمبی دیواریں چلی گئی تھیں اور بعض مقامات پر سرکنڈوں کی اونچی اونچی باڑیں کھڑی تھیں۔ ایک پہاڑی کے قریب جس کی ایک نچلی چٹان پر ہم پہنچنا چاہتے تھے ایک چھوٹی سی دیوار بقدر چار فٹ بلند ہمارے سامنے آئی جس پر سے ہم آسانی کے ساتھ پھلانگ گئے اور ہم نے اپنے آپ کو ایک چراگاہ میں پایا جس کے نشیب و فراز ہماری منزلِ مقصود کی رہبری کرتے تھے۔ چونکہ ڈر تھا کہ ہمیں دیر نہ ہو جائے ہم سبز پہاڑیوں پر دوڑتے اور ناہموار چٹانوں پر پھلانگتے پوری تیزی سے جا رہے تھے۔ میں ایک تھیلا جو میرے کندھے سے خوب مضبوطی سے بندھا ہوا تھا اٹھائے ہوئے تھا اور ایک ٹوکری جس کو سیاح لوگ اکثر اپنے ساتھ رکھتے ہیں۔ میری بیوی کے ایک بازو سے آویزاں تھی۔ اس میں شراب کی دو بوتلیں تھیں ایک میٹھی اس کے لئے اور دوسری ذرا ترش میرے لئے۔ کیونکہ میٹھی شراب مجھے مفید نہیں پڑتی۔

آخر کار ہم اس سبز پوش چٹان پر پہنچ گئے۔ مناظرِ غروب کے مشتاق اس نواح سے بخوبی آشنا ہیں میں فرطِ جوش سے دوڑ کر اوپر پہنچ گیا تاکہ میری نگاہیں جلد اس نظارے سے لطف اندوز ہوں لیکن میری بیوی ایک طرف بیٹھ گئی اور پیاس بجھانے کے لئے ایک دو گھونٹ شربت کے پی کر اور اپنی ٹوکری کو وہاں چھوڑ کر مجھ سے آملی۔ منظر حقیقتاً بیحد خوبصورت تھا۔ ہمارے نیچے ایک فراخ وادی جو تمام باغ و راغ تھی اور اس کی وسعت کو ایک پہاڑی نالہ عبور کرتا تھا دور تک پھیلی ہوئی تھی کہیں کہیں نگاہ سرخ اینٹوں کے مکانوں کی بلندیوں سے ٹکرا جاتی۔ اس سلسلہ کوہ کے پیچھے جو قدرت کی حیرت انگیز رنگ آمیزیوں اور تماشیوں کا مظہر تھا اٹلی کا نیلگوں آسمان پھیلا ہوا تھا جس کو غروب آفتاب کی کرنوں نے تختۂ زر بنا رکھا تھا۔

میں اور میری بیوی امریکہ کے رہنے والے ہیں اور اس قصے کے وقت ہم دونوں ادھیڑ عمر کے تھے۔ قدرت کی رعنائیاں ہمیں ایک دوسرے کی صحبت میں بہت محفوظ کرتیں۔ ہمارا ایک لڑکا بھی تھا جسے ہم دونوں بہت چاہتے تھے مگر وہ اس وقت جرمنی میں تعلیم حاصل کر رہا تھا۔ ہماری صحت یوں تو اچھی تھی مگر فربہی اور سرخی سے ہم دونوں بے بہرہ تھے! اور اس لئے طویل دیہاتی دوروں اور سیاحت کا ذوق بھی ہم میں کم تھا۔ میں ایک متوسط القامت انسان تھا اور میرے جسم کی نشوونما ایسی نہیں ہوئی تھی جیسی کہ ہونی چاہئے تھی لیکن میری بیوی کی صحت اچھی تھی اور روز بروز بہتر ہو رہی تھی۔ آپ شاید حیران ہونگے کہ ادھیڑ عمر کا ایک جوڑا جس میں فریقین نہ بہت قوی و توانا اور نہ پیادہ چلنے کے لئے بہت موزون تھے اس طرح ایک سات میل لمبی سیر پر نکل جائیں۔ اور راستہ میں دیواروں پر پھلانگتے اور پہاڑوں کی بلندیوں پر چڑھتے جب منزلِ مقصود پر پہنچیں تو ان کی حالت ایسی ہو کہ ان کے دل غروبِ آفتاب کی کیفیت سے متاثر اور محظوظ ہو سکیں۔ لیکن میں اب اس عجیب بات کی تشریح کئے دیتا ہوں۔

مجھے علم و حکمت میں ہمیشہ دلچسپی رہی تھی اور اب اپنے کاروبار زیست سے دستکش ہونے پر میں نے ان کو اپنے اوقاتِ فرصت کا مشغلہ بنا لیا تھا۔ ہمارا گھر ایک چھوٹے سے قصبہ میں واقع تھا اور اپنے خانگی باغیچہ کے ایک کونے میں میں نے ایک معمل بنا رکھا تھا۔ جہاں میں اکثر اپنے تجربے وغیرہ کیا کرتا تھا۔ مدت سے میں ایک قدرتی طاقت کو جسے میں جاذبۂ منفی سے موسوم کرتا تھا پیدا کرنے اور کام میں لانے کی تدبیر کر رہا تھا۔ جاذبۂ مثبت ہر ایک چیز کو زمین کے مرکز کی طرف کھینچتی ہے اس لئے جاذبۂ منفی ایک ایسی طاقت تھی جو اشیاء کو مرکزِ ارض سے دور لے جائے اس طاقت کے دریافت کے فوائد حیز بیان سے خارج ہیں مختصراً یہ کہ وہ دنیا کے بے شمار اور گوناگوں بوجھوں کو پرِ کاہ کی طرح ہلکا کر سکتی تھی۔ میں سالہا سال کی محنت اور مایوسیوں کا یہاں ذکر نہیں کرنا چاہتا۔ اتنا

کتنا کافی ہوگا کہ انجام کار ہیں جاذبہ منفی کو پیدا کرنے جمع کرنے اور ضبط میں
لانے کے ایک طریقے کی دریافت میں کامیاب ہوگیا۔

میری اس ایجاد کی کل اپنی ساخت میں تو بہت پیچیدہ تھی مگر
اس سے کام لینے کا طریقہ بالکل سادہ تھا۔ میری مشین ایک آٹھ انچ لمبے
اور چار انچ چوڑے فلزی خول میں آسکتی تھی۔ اور ایک پیچ کے دباؤ سے
جو باہر سے پھرایا جاتا تھا اس سے کام لیا جاسکتا تھا۔ جونہی یہ دباؤ پڑتا
جاذبہ منفی پیدا ہونی شروع ہوجاتی۔ اور اس کی کمی یا زیادتی کا دارومدار
دباؤ کی کمی بیشی پر ہوتا۔ اگر پیچ باہر کو پھرتا تو دباؤ کم ہوجاتا اور یہ طاقت بھی
نسبتاً گھٹ جاتی حتی کہ پیچ کو آخیر تک پھرانے سے جاذبہ منفی کا عمل
کالعدم ہوجاتا۔ اس طرح اس طاقت کو حسب دلخواہ تیز یا سُست
کیا جاسکتا تھا۔

جونہی یہ چھوٹا سا آلہ میری حسب مرضی کام کرنے لگا میں نے
اپنی بیوی کو معمل میں بلاکر اس کے سامنے اس کی نوعیت اور اس کے
فوائد بیان کئے۔ وہ یہ تو جانتی تھی کہ میں کسی اہم مقصد کے حصول میں
کوشاں ہوں مگر میں نے اس سے کبھی یہ نہیں کہا تھا کہ یہ مقصد کیا ہے
اب میں نے ہر ایک بات وضاحت سے اسے سمجھائی۔ یعنی اپنے آلہ
کی ساخت نیز وہ فوائد جو اس سے حاصل کئے جاسکتے تھے۔ میں
نے اسے بتایا کہ اس کے ذریعے سے تمام مادی اشیا کے بوجھ کو کم بلکہ
قطعاً نابود کیا جاسکتا ہے مثلاً یہ کہ اگر ایک بھاری لدی ہوئی گاڑی کے
دونوں طرف اس قسم کے دو آلے باندھ دئے جائیں اور ہر ایک کے پیچ
کو ایک کافی درجہ تک کس دیا جائے تو زمین پر اس کا دباؤ ایک خالی
گاڑی سے زیادہ نہ ہوگا۔ اور ایک چھوٹا سا مریل گھوڑا بھی اس کو آسانی
سے کھینچ سکیگا۔ اور اگر بالفرض ایک بھاری گٹھے کے ساتھ اس کو چپاں
کردیا جائے تو ایک بچہ بھی اس کو اٹھا کرلے جاسکیگا۔ ایک بڑی موٹر کار
کو متعدد آلات کی وساطت سے ہوا میں اس طرح اٹھایا جاسکیگا کہ وہ
غبارے کی مانند فضا میں اُڑتی پھرے۔ غرضیکہ میں نے بہت سی ایسی
چیزیں اس کو بتائیں جن میں میری ایجاد کو استعمال کیا جاسکتا تھا۔ اور اور
بھی بتاتا اگر وہ یکلخت زار زار رونا شروع نہ کردیتی۔ اس نے چلاکر کہا
بلاشبہ دنیا کو ایک عجیب وغریب شے مل گئی ہے مگر افسوس میرے ہاتھ
سے ایک خاوند جاتا رہا۔ میں نے حیرت کے لہجے میں اس سے پوچھا کہ
یہ کیسے۔ جس کے جواب میں وہ بولی کہ میں نے اب تک تو اس کا چنداں
خیال نہ کیا تھا کیونکہ تمہارے دل بہلانے کا یہ ایک ذریعہ تھا اور ہماری
خانگی مسرتوں کے ساتھ یہ کبھی متصادم نہ ہوتا تھا۔ مگر وہ مسرتیں اب سب
گئی گذری ہوئیں۔ یقیناً یہ ایجاد کامیاب ہوگی اور ممکن ہے کہ تم اس کے
ذریعے سے بہت سا روپیہ بھی کماؤ۔ مگر ہمیں روپیہ کی ضرورت نہیں۔
اگر ضرورت ہے تو اس فارغ البالی اور خوشی کی جو اب تک ہمارے قبضے
میں رہی ہے۔ مگر اب حفاظتی پروانوں، مقدموں اور تجربوں کا دور دورہ
ہوگا۔ بعض لوگ تمہیں سودائی کہیں گے۔ بعض دعویٰ کرینگے کہ انہوں نے
تم سے بہت عرصہ پہلے اس کو دریافت کرلیا تھا اور بیشمار لوگ تمہیں
دیکھنے کے لئے آیا کرینگے۔ اور تمہیں طوعاً کرہاً کئی جگہ جانا پڑے گا۔ اور
تم بالکل ایک مختلف انسان بن جاؤگے۔ اور پہلی سی فراغت وشادمانی
پھر کبھی ہمیں نصیب نہ ہوگی۔ کروڑوں روپے بھی اس کی تلافی نہ
کرسکیں گے۔

میری اہلیہ کے ان الفاظ نے مجھ پر بڑا اثر کیا۔ اس کو بتانے سے
پہلے ہی اس قسم کے خیالات مجھے پریشان کررہے تھے۔ اس سے پہلے
کبھی وہ میرے دل میں پیدا نہیں ہوئے تھے۔ بے شک اس شغل میں
میری دلچسپی بیحد تھی مگر میں نے کبھی اس کو اپنی زندگی کا مقصد نہیں بنایا
تھا۔ مگر اب ہر چیز مختلف معلوم ہونے لگی۔ اب میں محسوس کرنے لگا کہ
میرا یہ فرض عین ہے کہ اپنی اور بنی نوع انسان کے سود وبہبود کی خاطر
اپنی ایجاد کو دنیا کے سامنے پیش کروں۔ مگر ایسا کرنے کے لئے مجھے کیا
طریقہ اختیار کرنا چاہئے۔ مجھے اندیشہ تھا کہ اس معاملہ میں لغزش یا غلطی
کے نتائج خطرناک ہونگے۔ ممکن ہے کہ دنیا کو جب اس کا علم ہو تو سینکڑوں
ماہرین طبعیات اس کام میں لگ جائیں اور یہی نتائج پیدا کرنے کے اور
ذرائع دریافت کرلیں۔ لہذا مجھے تمام قسم کے تحفظات کو کام میں لانا چاہئے
یہ بھی لازمی تھا کہ دنیا کے تمام حصوں کے لئے حفاظتی احکام حاصل کرلوں
غرضیکہ جیسا کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں اس قسم کے خیالات میرے دماغی توازن
کو تہ وبالا کررہے تھے۔ اس قسم کی اندرونی شورش اور گڑبڑ میری عمر اور مزاج
کے انسان کے لئے موزون نہ تھی۔ اور جس وقت میری بیوی نے نالہ و
بکا کے ساتھ وہ الفاظ کہے تو میں بھی یہ محسوس کرنے سے نہ رہ سکا کہ غالباً
اب ہماری خاموش اور مطمئن زندگی میں ایک ہلچل پڑ جائیگی۔ چنانچہ میں
نے اس سے کہا کہ مجھے تم سے پورا اتفاق ہے اور میرا بھی یہی خیال ہے
کہ یہ چیز ہمارے لئے بجائے ایک رحمت کے زحمت ثابت ہوگی اور اگر
مجھے اس کے فوائد سے دُنیا کی محرومی کا خیال نہ ہوتا تو میں غالباً اس
کا خیال مطلقاً ترک کردیتا۔ اگرچہ مجھے اپنی اس ایجاد سے بہت سی ذاتی

فلاح و بہبود کی بھی توقع تھی۔

میری بیوی گرمجوشانہ آواز میں بولی "سنو! اس کو ترک کرنے کا خیال مت کرو۔ تم اس ایجاد کو دل کھول کر اپنی تفریح کے لئے استعمال کرو مگر عوام کو اس کا علم نہ ہونے دو۔ ہمارے بعد یہ ایجاد ہربرٹ کی ملکیت ہوگی۔ اور اس وقت تک وہ ازروئے بالغ نظری فیصلہ کرنے پر قادر ہوگا کہ اسے اپنی ذاتی منفعت کے لئے استعمال کرے یا بلا معاوضہ دنیا کے حوالے کردے"

میں نے اپنی بیوی کی نصیحت پر عمل کیا۔ اور اپنی ایجاد کی ایک پوری تشریح لکھ کر اسے ایک سربمہر لفافے میں بند کرکے اپنے قانونی مشیر کو دیدیا کہ میری موت کے بعد میرے لڑکے کو دے دیا جائے۔ اور اگر بالفرض وہ مجھ سے پہلے مرجائے تو میں کوئی اور انتظام کروں گا تب میں نے عزم راسخ کرلیا۔ کہ اپنی ایجاد کو محض اپنی تفریح کے لئے کام میں لاؤنگا۔ اور کسی فرد کو حتیٰ کہ اپنے بیٹے کو بھی اس کے متعلق کچھ نہ کہونگا۔

لہٰذا میں نے ایک چمڑے کا تھیلا خریدا۔ اور اس کے اندر اس آلہ کو لگا دیا اس طرح کہ اس کا پیچ باہر سے پھر سکے۔ تھیلے کو تسمے کے ذریعہ سے میں اپنے کندھے سے باندھ لیتا اور میری بیوی پیچ کو جو پشت کے جانب رہتا آہستگی سے پھراتی حتیٰ کہ تھیلے کا میلان صعود مجھے اُٹھانا شروع کردیتا اور جب اس سہارے کی وجہ سے میں محسوس کرتا کہ میرا وزن پندرہ بیس سیر سے زیادہ نہ ہوگا۔ تو میں سیر و تفریح کے لئے روانہ ہوجاتا۔ چلنا پھرنا میرے لئے محنت مشقت کا کام نہ رہا۔ ایک آدمی کی طاقت اور بچے کے بوجھ کے ساتھ مجھے سیر و خرام سے ایک خاص لذت حاصل ہوتی۔ پہلے دن میں تقریباً بارہ میل چلا۔ اور واپسی پر مجھے تکان کا خفیف سے خفیف احساس بھی نہ تھا۔ بتدریج یہ سیاحتیں میری زندگی کی سب سے بڑی مسرت بن گئیں۔ بسا اوقات جب میں اپنے آپ کو بالکل تنہا پاتا۔ اور کوئی متنفس گرد و پیش دکھائی نہ دیتا تو میں بڑی بڑی بلند باڑوں اور چٹانوں کے اوپر سے پھلانگ جاتا۔ ندی نالوں پر سے ایک جَست میں کود جاتا۔ اور سمجھتا کہ گویا میں سرعت رفتار کا دیوتا ہوں۔

اب میں اس قسم کے ایک اور آلے کی تیاری میں لگ گیا تاکہ میری بیوی بھی میری سیر و سیاحت میں میرا ساتھ دے سکے۔ مگر جب یہ مکمل ہوگیا تو اس نے اس سے مستفید ہونے سے انکار کردیا وہ کہنے لگی "میں یہ چمڑے کا جھولا نہیں پہن سکتی۔ اس کے علاوہ یہاں سب لوگ جانتے ہیں کہ میں زیادہ پیادہ پا چلنے والی عورت نہیں ہوں۔ مجھے دیکھ کر لوگ خواہ مخواہ چرچا کریں گے"

وقتاً فوقتاً میں اس دوسرے آلے سے بھی کام لیتا۔ مگر یہاں میں صرف ایک مثال پیش کروں گا۔ میرے ذخیرۂ اناج کی عمارت کی بنیادیں کچھ مرمت طلب تھیں۔ اس غرض کے لئے ایک بڑی دو اسپہ گاڑی عمارتی پتھروں سے بھری ہوئی میرے احاطے میں کھڑی تھی۔ شام کے وقت جب مزدور لوگ چلے گئے تو میں نے اپنے دونوں آلوں کو مضبوط زنجیروں سے گاڑی کے دونوں طرف باندھ دیا اور تب پیچوں کو پھرایا۔ گاڑی کے وزن میں معتد بہ کمی ہوگئی۔ میرے پاس ایک بوڑھا گدھا تھا جس پر کسی زمانہ میں ہربرٹ کو سوار کیا جاتا تھا۔ اور جسے کبھی کبھی اب ہم سٹیشن سے پارسل وغیرہ لانے کی غرض سے ایک چھوٹی سی گاڑی کے آگے جوت لیتے تھے۔ میں اصطبل میں گیا۔ اور اس کمزور کہنہ سال ہستی پر ساز ڈال کے لے آیا۔ اور اس چھکڑے سے اس کو جوت دیا۔ اور جب میں نے اس کو چلایا تو حسب توقع اس تمام بوجھ کو اپنے پیچھے لیکر ایسی سرعت اور آسانی سے چلا گویا اپنی اُسی بچہ گاڑی کو کھینچ رہا ہے۔ میں نے اس کا رُخ شارع عام کی طرف کردیا اور وہ اس پر بے تکان چلنے لگا۔ آخر موڑ کر میں اس کو پھر احاطے کے اندر لے آیا۔ اس تجربے نے میری ایجاد کے اہم فوائد کو ثابت کردیا۔

اس کے چند مہینے بعد ہم اپنے یورپی سفر پر روانہ ہوگئے جو زیادہ تر ہربرٹ کی خاطر تھا۔ اس غریب کی حالت بڑی دردناک تھی۔ اور اس کے ساتھ ہماری بھی۔ وجہ یہ ہوئی کہ ہم نے اس کی نسبت اپنے ایک معزز ہمسائے کی لڑکی کے ساتھ کردی تھی۔ اس شادی سے ہماری بڑی بڑی اُمیدیں وابستہ تھیں کیونکہ ہمیں یقین تھا کہ یہ ہربرٹ کے لئے ہر پہلو سے زندگی میں بے شمار فوائد و برکات کا سرچشمہ بنیگی۔ ہربرٹ کی منسوبہ جینٹ کے والدین میں سے صرف گلبرٹ اس کا والد ہی زندہ تھا مگر اس نے اچانک کسی نامعلوم مصلحت کی بنا پر اس رشتے کو قطع کردیا۔ اور اپنی لڑکی سمیت مغرب کی جانب سیاحت کے لئے چلا گیا۔

اس صدمے سے بیچارے ہربرٹ کی سخت دل شکنی ہوئی۔ چنانچہ اپنا مطالعہ چھوڑ کر وہ گھر آگیا اور بیمار سا رہنے لگا تب ہم اس کو یورپ لے گئے اور براعظم کی دو تین ماہ کی سیر کے بعد ہم نے اس کی درخواست پر اس کو جرمنی میں چھوڑ دیا۔ جہاں اس کا خیال تھا کہ وہ اپنے مطالعہ کو جاری رکھ سکیگا۔ اور خود ہم دونوں میاں بیوی اٹلی کے اس گاؤں میں چلے آئے جہاں اس قصہ کا آغاز ہوتا ہے۔

میری بیوی بھی اس صدمے سے نہایت متأثر ہوئی تھی اور چونکہ حصولِ صحت کی غرض سے اس کے لئے دیہاتی فضا میں میدانی ورزش اور تازہ ہوا نہایت ضروری تھے۔ اس لئے میں اس کو یہاں لے آیا تھا۔ وہ دونوں آلے بھی میرے ساتھ تھے۔ ایک تو حسبِ معمول اس چرمی تھیلے میں پیوستہ تھا اور دوسرے کو میں نے ایک بہت بڑے اور بھاری آہنی صندوق کے اندر لگا دیا تھا۔ اور چونکہ یورپ میں محصولات بحری اور شہری کی شرح نہایت سنگین ہے اس لئے میں نے اس سے بہت سا روپیہ بچا لیا تھا تمام وزنی چیزیں اس آہنی صندوق میں ڈال دی گئی تھیں، کتابیں کاغذات فولادی سامان، سنگِ مرمر کے کتبے اور یادگاریں مع ان تمام دیگر متفرقات کے جو بالعموم ایک سیاح کے اسباب کو وزنی کر دیتے ہیں۔ اس کے بعد جاذبہ منفی کے پیچ کو اس حد تک ڈھیلا کر دیا گیا تھا کہ ایک معمولی قلی اس صندوق کو اُٹھا سکے۔ اگر میں چاہتا تو اسے بالکل بے وزن بھی کر سکتا تھا مگر یہ مجھے پسند نہ آیا کیونکہ میرے اسباب کی کم وزنی پر پہلے ہی کچھ بحث ہو چکی تھی۔ اور میں ایسے اشخاص کی نسبت نہایت دلخراش گفتگو سُن چکا تھا۔ جو خالی صندوق ساتھ لیکر سفر کیا کرتے ہیں۔ اس خیال سے میری بیوی بھی اثنائے سیر میں میری ایجاد سے مستفید ہو سکے میں نے اب اس آلے کو صندوق سے اُکھاڑ کر اس ٹوکری کے اندر لگا دیا تھا جسے وہ اکثر اپنے ہاتھ میں رکھتی تھی۔ اس سے اس کو حیرت انگیز مدد ملتی۔ ایک ہاتھ میں ٹوکری اور دوسرا میرے کندھے پر رکھ کر وہ پوری سہولت سے میرے دوش بدوش چلی آتی۔ اور اس جگہ وہ اپنی طویل سیروں پر معترض بھی نہ ہوتی کیونکہ یہاں کسی کو علم نہ تھا کہ وہ پیادہ پا سیاحت کی علوی نہیں ہے۔ وہ ہمیشہ اس ٹوکری میں کچھ مزیدار ناشتا اور شربت اپنے ساتھ رکھتی نہ صرف اس لئے کہ یہ چیزیں ہمیشہ ہمیں خوش آتیں بلکہ اس لئے بھی کہ خالی ٹوکری کو اُٹھائے پھرنا ایک مضحکہ انگیز امر تھا۔

جس ہوٹل میں ہمارا قیام تھا۔ اس میں بہت سے انگریز بھی ٹھیرے ہوئے تھے مگر چونکہ وہ سب پیادہ چلنے کی بہ نسبت گاڑی میں سیر کرنے کے زیادہ مشتاق تھے اس لئے ان میں سے کوئی ہمارا ساتھی بننے پر تیار نہ تھا اور یہ امر ہمارے لئے مزید خوشی اور اطمینان کا موجب ہوا مگر ایک شخص اپنی پیدل چلنے کی قابلیت پر بڑا نازاں تھا۔ وہ کسی الپائن کلب کا رکن بھی تھا اور ہمیشہ ایک انوکھا سا لباس پہنے رہتا تھا یعنی نیم پاجامہ اور اس کے نیچے اُون کے لمبے موزے جو اس کی بے اندازہ موٹی پنڈلیوں کو ہمیشہ ڈھانپے رہتے۔ ایک روز شام کے وقت اُس سے میری کوہ پیائی کے متعلق کچھ تکرار ہو گئی۔ اور میں نے اُس کو مقابلے کی دعوت دی وہ اس پر رضامند ہو گیا۔ اور دوسرے دن سہ پہر کے وقت ہم دونوں ایک پہاڑ پر چڑھنے کے لئے روانہ ہو گئے۔

اس نے مجھ سے پوچھا کہ تمہارے تھیلے میں کیا ہے میں نے کہا ایک ہتھوڑا معدنی نمونوں کی شناخت کے لئے۔ ایک دُور بین اور ایک شربت کی صراحی اور بس۔ میرے جواب نے اُس کی تشفی کر دی جس پہاڑ کو ہم نے منتخب کیا تھا وہ آبادی سے دو میل کے فاصلے پر تھا۔ اس کا وہ پہلو جو ہماری جانب تھا عمودی تھا اور چوٹی بہت بلند تھی مگر شمال کی طرف یہ پہاڑ بتدریج ڈھلوان ہوتا جاتا تھا۔ ڈھلوان کے اُوپر سے ایک رستہ پیچ و خم کھاتا اس کی چوٹی کو جاتا جہاں ایک گاؤں واقع تھا میرے ساتھی نے کہا "غالباً تم اس ڈھلوان پر سے چڑھنا پسند کرو گے"۔ میں نے کہا "نہیں اتنا لمبا چکر کاٹنے کی کیا ضرورت ہے۔ ادھر سے بھی ایک تنگ راستہ اُوپر کو چڑھتا ہے۔ اور میں نے اکثر گڈریوں کو اپنے ریوڑوں سمیت اس پر آتے جاتے دیکھا ہے"۔ اس پر وہ بولا "بہت خوب! مگر تم اس راستے کو ذرا ہمت شکن پاؤ گے"۔ میں نے یہ کہہ کر کہ "کوئی مضائقہ نہیں" اپنی پوری رفتار سے چڑھنا شروع کر دیا۔

میری بیوی نے آلے کے پیچ کو معمول سے زیادہ کس دیا تھا۔ چنانچہ چلنے میں مجھے بالکل زور نہیں لگانا پڑتا تھا۔ اور اپنے تمام علائق سمیت میں پہاڑ کی جانفرسا بلندیوں پر بے مثال تیزی سے چڑھ رہا تھا پہلے تو میرا ساتھی میرے آگے آگے تھا تاکہ مجھے پہاڑ پر چڑھنے کا سلیقہ بتاتا جائے لیکن جلد ہی میں اُس سے آگے بڑھ گیا۔ اس کے بعد ایڑی چوٹی کا زور لگا کر بھی وہ مجھ تک نہ پہنچ سکا۔ عمودی بلندیوں پر میں رواں رواں چڑھتا۔ چٹانوں پر سے سبک رفتاری سے گذر کر راستے کے پیچ و خم سے احتراز کرتا ایسی خوبی سے جا رہا تھا جیسے کوئی ہموار زمین پر چل رہا ہو۔ میرا ساتھی نیچے سے گلا پھاڑ کر آوازیں دیتا۔ اور کہتا کہ دیکھو پہاڑ پر چڑھنے کا یہ طریقہ نہیں۔ مگر میں اس کے جواب میں کہتا کہ ہو نہ ہو میرا طریقہ تو یہی ہے۔ اس کے بعد میں چوٹی پر پہنچ گیا۔ اور تقریباً نصف گھنٹے کے بعد میرا ساتھی ہانپتا کانپتا اپنے سُرخ چہرے کو رومال سے پونچھتا آ پہنچا۔ اور پہنچتے ہی چلایا کہ جہنم میں جائے ایسا مقابلہ میں تو عمر بھر ایسی تیزی سے کبھی پہاڑ پر نہ چڑھا تھا۔ اور کبھی ایسے شخص سے دوچار نہیں ہوا تھا جس نے ایسی دوڑوں میں ایسی بیہودگی اور ناعاقبت اندیشی

سے کام لیا ہو۔ جیسا کہ تم نے لیا ہے۔ میں نے کہا کہ میں کوئی وجہ نہیں دیکھتا کہ تم کیوں اس کو بیہودگی سے موسوم کرتے ہو۔ میں تو باآسائش بلاتکلیف اس جگہ پہنچ گیا ہوں۔ اس کے جواب میں وہ کچھ نہ بولا۔ اور میری طرف پشت کرکے اپنے آپ کو ٹوپی سے ہوا دیتا اور بہت کچھ بڑبڑاتا رہا۔

کچھ دیر کے بعد میں نے کہا کہ اب ہمیں اُترنا چاہیئے۔ اسے بھی سوائے اتفاق کے چارہ نہ تھا۔ واپسی کے دوران میں مجھے اُترائی چڑھائی کی بہ نسبت زیادہ خوشگوار معلوم ہوتی تھی۔ میں اکثر چٹانوں کے تیز کناروں اور عمودی اُبھاروں پر سے جن کی بلندی آٹھ یا دس فٹ ہوتی تھی کود پڑتا۔ اور زمین پر ایسی نرمی اور سُبکی سے گرتا گویا میں صرف دو فٹ کی بلندی سے کودا ہوں۔ بلند ڈھلوان چٹانوں پر میں ہرن کی طرح چوکڑیاں بھرتا اور آسانی کے ساتھ اپنے عصا کے ذریعہ اپنے آپ کو تھام لیتا۔ اور اگرچہ میں خطرناک مقامات سے احتیاط سے بچتا تاہم میری یہ دوڑ اور یہ پھلانگیں ایسی تھیں کہ انسان ان سے عاجز ہے۔ میں نے صرف ایک دفعہ اپنے ہمراہی کو چلّاتے سنا کہ خبردار! تمہاری جان کی خیر نہیں!! مگر میں نے مڑ کر اسی لہجے میں جواب دیا کہ ہرگز مت ڈرو اور اس کو بہت پیچھے چھوڑ گیا۔

نیچے پہنچ کر اس کا انتظار کئے بغیر میں اپنے ہوٹل کو چل پڑا۔ اور کوئی ایک گھنٹے کے بعد جب میں تازہ دم اور ہشاش بشاش کھانے کے لئے اپنے کمرے سے نیچے آیا۔ تو عین اُس وقت میرا وہ کوہ ایلپس پر چڑھنے والا دوست پسینے میں شرابور، گرد آلود اور سوگوار چہرہ بنائے آن پہنچا۔

میں نے اس کا انتظار نہ کرنے پر معذرت کی مگر میری طرف التفات کئے بغیر وہ سیدھا اپنے کمرے میں گھس گیا۔ جب میں نے یہ سارا قصہ اپنی بیوی سے بیان کیا تو وہ بولی کہ یہ بعید از انصاف ہے۔ اُس کو کیا معلوم تھا کہ کیا چیز تمہاری مدد کر رہی ہے۔ میں نے کہا یہ بالکل مناسب اور جائز تھا۔ اگر اُس کے پاس جاذبہ منفی کا آلہ نہ تھا تو میرے پاس بھی تو اس جیسی جسمانی طاقت کسب فن اور کہنگی مشق نہ تھے۔ وہ اُن کے بل چڑھا۔ اور میں اپنی جدت اور ذکاوت طبع کے بل۔ یعنی میری دماغی طاقت اُس کی جسمانی طاقت سے لڑ رہی تھی۔ اس طرح ہم دونوں بالکل انصاف پر تھے۔

اس لمبی چوڑی تفصیل کے بعد کہ کس طرح ہم دو ادھیڑ عمر کے میاں بیوی جن میں پیادہ پا چلنے کی جسمانی اہلیت نہ تھی اتنا اناپ شناپ ساتھ لے کر ایک ایسی لمبی سیر پر جس کی مسافت ہر دو طرف چودہ میل سے کم نہ تھی اور جس کا نصف حصہ چڑھائی تھی روانگی کی جرأت کرسکے۔ اب میں پھر اُس وقت کی طرف متوجہ ہوتا ہوں جب میں اور میری بیوی پہاڑی کی اُس چوٹی پر کھڑے غروبِ آفتاب کا دلفریب منظر دیکھ رہے تھے۔ جب روشنی مدھم پڑ گئی اور جھٹ پٹا ہوگیا تو ہم لوٹے تاکہ قصبے کو واپس جائیں۔ دیکھا تو میری بیوی کی ٹوکری نابود تھی۔ وہ گھبرائی کیونکہ اُس کے بغیر اس کی واپسی محالات سے تھی۔ آپ کو یاد ہوگا کہ میں نے دوسری مشین اس کی مدد کے لئے اس ٹوکری کے اندر لگا رکھی تھی۔ غور و تحقیق کے بعد ہمیں خیال ہوا کہ شاید وہ شربت پینے کے لئے بوتلوں کو ٹوکری سے نکالنے کے بعد آلے کے پیچ کو ڈھیلا کرنا بھول گئی۔ اور ٹوکری جو کہ اس وقت اس کے پیچھے رکھی ہوئی تھی۔ اس کے حکم کے بغیر ہوا میں اُڑ گئی۔ یہ خیال آتے ہی میں نے اپنی دوربین لگا کر فضا میں ادھر اُدھر دیکھنا شروع کیا۔ کچھ عرصے کے بعد دُور بلندی پر ہوا میں ٹوکری اُڑتی ہوئی نظر آئی۔ ہمارا قیاس درست نکلا۔ اب ٹوکری تو ہاتھ آنے سے رہی۔ اور اس کے ساتھ وہ آلہ بھی ہمیشہ کے لئے سطح زمین سے جاتا رہا۔ تاہم میری بیوی نے اپنا ایک ہاتھ میرے کندھے پر رکھ دیا۔ اور میں نے اپنا اس کی کمر میں حمائل کرکے اس کو اپنے پہلو کے ساتھ لگا لیا اُس نے میرے آلے کے پیچ کو جو کہ میری پشت کی جانب تھا۔ دوسرے ہاتھ سے اور کس دیا۔ اور اس طرح ہم بسہولت تمام وقت پر واپس پہنچ گئے۔ ہوٹل کے دروازے پر ایک سفری گاڑی کھڑی تھی۔ اور اس کے ایک طرف سے ہو کر گذرنا ضروری تھا۔ چنانچہ میری بیوی پہلے گذری۔ میں نے اس کے پیچھے جانا چاہا۔ مگر مجھے تعجب ہُوا کہ میرے پاؤں کے نیچے سوائے ہوا کے کچھ نہیں۔ میں نے پورے زور سے زمین پر قدم رکھنے اور چلنے کی کوشش کی مگر میری ٹانگیں ہوا میں ہل کر رہ جاتیں میرے خوف و ہراس کی کوئی حد نہ رہی جب مجھے یہ معلوم ہُوا کہ میں ہوا میں بلند ہو رہا ہوں۔ لیمپوں کی روشنی سے جو میرے نیچے تھے۔ میں نے جلدی سمجھ لیا کہ میں زمین سے تقریباً بیس فٹ اونچا ہوں۔

وہ سفری گاڑی چلی گئی اور اندھیرے میں مجھ کو کسی نے نہ دیکھا۔ میں جانتا تھا کہ دراصل بات کیا ہے۔ جاذبہ منفی کے آلے کو مجھے اور میری بیوی ہر دو کے سہارے کے لئے اس قدر کس دیا گیا تھا۔ کہ جب اُس کا بوجھ ہٹ گیا تو وہ مجھ اکیلے کو زمین سے کافی بلندی تک اُٹھانے کے لئے کافی تھا۔ یہ دریافت کر کے مجھے ایک گونہ اطمینان ہو گیا کہ میں اس سے زیادہ اُوپر نہیں جاؤنگا۔ اور اس طرح ہوٹل کی دوسری منزل کی کھڑکیوں کے برابر ہوا میں معلق رہا۔

اب میں نے کوشش کرنی شروع کی کہ کسی طرح پیچ کے سرے کو جو تھیلے میں تھا پکڑوں تاکہ اسے پھرا کر جاذبہ منفی کی طاقت کو کم کر سکوں۔ مگر باوجود سخت جدوجہد کے میرا ہاتھ اس تک نہ پہنچ سکا۔ کیونکہ میری آسائش کی خاطر اور توازن قائم رکھنے کے لئے تھیلے کے اندر آلے کو میری پشت پر ایسی جگہ رکھ دیا گیا تھا کہ میرے ہاتھ کا وہاں پہنچنا ناممکن تھا۔ اور آلے کو اس طرح رکھنے کے وقت اس امر کا چنداں خیال بھی نہ تھا کیونکہ بوقت ضرورت میری بیوی ہمیشہ اس کے پیچ کو پھرا دیتی تھی۔

جب مجھے یقین ہو گیا۔ کہ پیچ تک میری رسائی محال ہے۔ تو مجھے ڈر آنے لگا۔ میری موجودہ حالت یہ تھی کہ میں فضا میں لٹک رہا تھا اور زمین تک پہنچنے کے لئے میرے پاس کوئی ذریعہ نہ تھا۔ مجھے کوئی توقع نہیں تھی کہ میری بیوی میری تلاش میں باہر آئیگی۔ کیونکہ وہ قدرتاً یہ سمجھی ہوگی کہ میں اپنے کسی دوست سے بات کرنے کو ٹھیر گیا ہوں۔ تھیلے کو اُتار کر پھینک دینا میرے لئے موجب ہلاکت تھا کیونکہ اس طرح میں ایکدم سے زمین پر گر کر مرجاتا یا میری بعض ہڈیاں چور چور ہو جاتیں۔ یہ بھی نہیں ہو سکتا تھا کہ اس قصبے کے سادہ لوح باشندوں کو اپنی مدد کے لئے بلاؤں کیونکہ اگر وہ مجھ کو اس طرح ہوا میں تیرتے ہوئے دیکھ پاتے تو یقیناً جن یا بھوت سمجھ کر وہ مجھے گولیوں کا نشانہ بناتے۔ ہلکی ہلکی ہوا چل رہی تھی۔ اور اگر یہ مجھ کو کسی درخت کے نزدیک اُڑا کر لے جاتی تو میں درخت کو پکڑ کر نیچے اُتر آتا۔ مگر شامتِ اعمال سے وہاں کوئی درخت بھی نہ تھا۔ اگر میں مکانات کی چھتوں کی بلندی تک پہنچ سکتا تو کسی چھت کو پکڑ کر اپنی اس مصیبت سے نجات پا لیتا۔ مگر آلہ کی موجودہ طاقت اس اندازہ پر رکھی گئی تھی کہ وہ مجھے اس سے اُوپر نہیں لے جا سکتا تھا اور نہ ہی انچ بھر اس سے نیچے آنے کی اجازت دیتا تھا۔ اگر میں کسی تار برقی کے کھمبے کو پکڑ سکتا تو اس سے چمٹ کر اس مصیبت سے خلاصی پا سکتا اور اس پر سے نیچے کو سرک آتا۔ مگر یہ سب کچھ ناممکن تھا۔

اسی ہیئتِ کذائی میں میں گلی میں ادھر سے اُدھر تیرتا پھرتا رہا۔ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کیا کروں۔ کبھی دل چاہتا کہ چلاؤں۔ مگر پھر سوچتا کہ اگر میں نے ایسا کیا تو لوگ مجھے سنگسار کر دیں گے۔ یا گولی سے مار ڈالیں گے۔ اور اگر وہ ایسا کرنے سے باز بھی رہے تو کم از کم میری ایجاد کا تمام راز دنیا پر افشا ہو جائیگا۔ مگر اس کے ساتھ یہ امر بھی واضح تھا کہ اگر میں نہ چلایا تو یا اپنے آپ کو زمین پر گرا کر جان دیدونگا یا ہوا میں اُسی طرح آویزاں بھوک پیاس اور موسم کی بے رحمیوں کا شکار ہو جاؤنگا۔ اس بات کا بھی اندیشہ تھا کہ رات کو فضا کی لطافت کی وجہ سے اگر میں اس سے زیادہ اُونچا یعنی سو سوا سو فٹ کی بلندی پر چلا گیا۔ تو پھر لوگوں کے لئے مجھ تک پہنچنا قطعاً ناممکن ہو جائیگا۔ خواہ وہ اس امر کو بھی تسلیم کیوں نہ کر لیں کہ میں از قسم بھوت پریت نہیں ہوں۔ اس صورت میں میرا انجام لامحالہ یہی ہوگا۔ کہ میں مر جاؤں اور جب پرندے میرا گوشت پوست نوچ لیں۔ تو میرا پنجر جرمی تھیلے کو اپنی پشت پر لٹکائے تا قیامت ہوا میں جھولا کرے۔

بلا شبہ یہ خیالات کچھ ایسے خوشگوار اور امید افزا نہ تھے۔ اور میں نے مصمم ارادہ کر لیا کہ اگر نیچے اُترنے کا کوئی ذریعہ دستیاب نہ ہوا تو میں جو ہو سو ہو چلا پڑونگا۔ مگر تا بہ حد امکان مجھے اس بلا کا مقابلہ کرنا چاہیئے اور کسی مدد کی آمد کا امیدوار رہنا چاہیئے۔ علاوہ ازیں ممکن ہے کہ بارش ہو جائے اور میرے رخت پارچہ جات کو بھگو کر مجھے اس قدر بوجھل کر دے کہ کسی بجلی کے کھمبے کی پستی تک پہنچ جاؤں۔

میں اسی اُلجھن میں تھا کہ میں نے نیچے بازار میں آگ کی ایک چنگاری کو اپنی طرف آتے دیکھا اور اس کے ساتھ ہی ایک آواز بھی سنی۔ یہ آواز اس الپائن کلب کے رکن کی تھی جو اپنے ایک ساتھی سے یہ کہہ رہا تھا کہ وہ تو یقیناً دیوانہ ہے دیکھنے کو تو حد درجہ کا نحیف البدن جسم پر گوشت بوٹی کا نشان نہیں۔ جس طاقت سے وہ پہاڑ پر چڑھا لا کلام قدرتی طاقت نہ تھی بلکہ صرف جنون کا ایک فوری جوش تھا جس نے اس میں اتنا زور پیدا کر دیا کہ اس وقت وہ دونوں عین میرے نیچے ٹھیرے اور کلب کے رکن

نے اپنی گفتگو کو جاری رکھتے ہوئے کہا " سودائی اور دیوانوں سے یہ کچھ بعید نہیں - میں نے ایک دفعہ ایک کمزور پست قد آدمی کو حالتِ دیوانگی میں ایسی جدوجہد کرتے دیکھا کہ چار پانچ اچھے خاصے قوی آدمی بھی اس کو نہیں سنبھال سکتے تھے " دوسرا بولا " آپ کا خیال درست ہے - مجھے بھی یہ حقیقت کچھ عرصے سے معلوم ہے "

یہ دوسری آواز مسٹر گلبرٹ کی تھی جو میرا ہم وطن اور میرے لڑکے کی منسوبہ جینیٹ کا والد تھا - وہی اس سفری گاڑی میں آیا تھا - کلب کے رکن سے اس کا تعارف تھا اور وہ دونوں میرے متعلق باتیں کر رہے تھے - میں ہمہ تن گوش ہو کر ان کے مکالمے کو سننے لگا -

مسٹر گلبرٹ نے اپنی بات کو جاری رکھا اور کہا کہ " میری لڑکی کا اس کے لڑکے سے رشتہ ہو گیا تھا - مگر اس کی حالت اس قدر خوفناک دیکھ کر میں نے اس رشتے کو فسخ کر دیا میں نہیں چاہتا تھا کہ میری لڑکی ایک پاگل کے لڑکے سے شادی کرے - ایسی عمر کے آدمی کے لئے جو ایک کنبے کا سرگروہ بھی ہو اس طرح ایک خاصہ ذہنی جھولا بغیر کسی ظاہری ضرورت کے اپنی کمر سے لٹکائے ایک بچھڑے کی طرح ادھر ادھر دوڑیں لگاتے پھرنا اور دیواروں، باڑوں، چٹانوں اور خندقوں پر سے ہرن کی طرح چھلانگیں لگانا یقیناً ایک خلافِ فطرت فعل ہے اور خالی از علت نہیں - مجھے خود ایک دفعہ اس کے جنون کی ایک ظالمانہ مثال اپنی آنکھوں سے دیکھنے کا اتفاق ہوا - میں اس کے مکان سے کچھ فاصلے پر رہا کرتا تھا - کیا دیکھتا ہوں کہ ایک روز اس نے اپنے ایک چھوٹے سے گدھے کو لاکر ایک بڑی دو اسپہ گاڑی سے جو پتھروں سے بھرپور تھی جوت دیا - اور اس بیکس حیوان کو اس شدت سے چابکیں لگانا شروع کیں کہ وہ بیچارا گاڑی کو لے سڑک پر آگیا - قریب تھا کہ میں جا کر اس کی اس وحشیانہ بے رحمی کے خلاف احتجاج کروں مگر میرے آنے سے پہلے ہی وہ اسے واپس اپنے احاطے میں لے گیا "

مسٹر گلبرٹ کی اس نکتہ چینی پر کلب کے ممبر نے یہ اضافہ کیا اس کی دیوانگی میں تو کوئی شک و شبہ نہیں - اور اس کو اس طرح آزادانہ چلنے پھرنے کی اجازت نہیں ہونی چاہئے مجھے اندیشہ ہے کہ وہ کسی دن اپنی بیوی کو کہیں اونچے پہاڑ کی چوٹی سے دھکیل دیگا محض اس لئے کہ فضا سے گرتے وقت اس کی قلابازیوں کا تماشہ دیکھے "

مسٹر گلبرٹ نے کہا " افسوس کہ وہ آج کل یہاں ہے - اس سے ملنا میرے لئے نہایت ناگوار ہوگا - میرا خیال ہے کہ میں اپنی لڑکی سمیت کل علی الصباح یہاں سے چلا جاؤں -

اس گفتگو کے بعد وہ دونوں واپس ہوٹل میں چلے گئے -

اس تمام انکشافات کو سن کر میں اپنی حالت بھول گیا - اس وقت صرف ایک خیال میرے دل میں موجود تھا اور وہ یہ کہ جس طرح بھی ہو سکے اور جتنی جلدی ہو سکے اس سارے معاملے کو از سرتا پا پوست کندہ مسٹر گلبرٹ سے کہہ دوں اور اس کی اصلیت کو اس کے ذہن نشین کر دوں خواہ اس کوشش میں مجھے یہیں سے کیوں نہ چلانا پڑے - عین اس وقت میں نے ایک سفید چیز کو اپنی سمت آتے دیکھا - قریب آنے پر میں نے اس کی طرز رفتار اور شکل و ہیئت سے سمجھ لیا کہ میری بیوی ہے جو سر کو اوپر اٹھائے ہوئے فضا میں مجھے ڈھونڈھ رہی ہے - میں نے اس کا نام لیکر پکارا - اور کہا کہ خدا کے لئے مجھے نیچے اترنے میں مدد دو مگر اس طرح کہ کوئی شخص نہ دیکھے - وہ بولی تو اچھا کس طرح ؟ میں نے کہا کہ اس رسی کے سرے کو پکڑ کر کھینچو - چنانچہ میں نے اپنی جیب سے ایک ڈوری کی پچیک کو نکال اس کے نیچے لٹکا دیا مگر خوبیٔ قسمت سے ڈوری چھوٹی نکلی اور اس کے ہاتھوں تک نہ پہنچ سکی - میں نے اپنا رومال اس کے ساتھ گانٹھ دیا - مگر پھر بھی یہ کمی پوری نہ ہو سکی - اس پر میں نے دبی آواز میں اس سے کہا کہ اب اور تو کچھ نہیں ہو سکتا - سوائے اس کے کہ تم جاؤ باغ کے دروازے کے اندر دائیں طرف ہوٹل کی دیوار کے ساتھ ماہی گیروں کے کچھ بانس کھڑے ہیں - ان میں سے ایک اٹھا لاؤ - چنانچہ بھاگم بھاگ وہ وہاں پہنچی اور ایک بانس اٹھا کر فوراً لوٹی - اپنے انگوٹھوں کے بل کھڑے ہو کر اس نے چھڑی کو ہوا میں بلند کیا مگر اس کا سرا صرف میری ایڑیوں اور پنڈلیوں کو چھوا - اور باوجود دیوانہ وار کوشش کے میں اپنے ہاتھ سے سرے کو پکڑنے سے قاصر رہا -

اس نازک موقعے پر اس کی مخصوص نسوانی ذکاوت اس کی مدد کو آئی - بانس کے ساتھ ایک ڈوری اور آہنی کنڈی لگی ہوئی تھی اس نے کنڈی کو بانس کے اوپر کے سرے کے ساتھ مضبوطی سے باندھ دیا اور پھر ہوا میں بلند کر کے میری پنڈلی کے ساتھ لگا کر اس کو

نیچے کو گھسیٹا۔ حسن اتفاق سے کنڈی میرے بوٹ کی ایڑی میں پھنس گئی۔ اب اُس نے آہستہ آہستہ نیچے کھینچنا شروع کیا۔ اور چند ہی منٹ میں میں زمین پر آ گیا۔ ایک ہاتھ مضبوطی سے میری کمر میں ڈال دو سرے سے اُس نے پیچ کو ڈھیلا کرکے تھیلے کو میری پشت پر سے اُتار دیا اور میں بازار میں خدا کی ٹھوس زمین پر جاذبہ منفی سے بالکل آزاد اور بے لوث کھڑا تھا۔

میری بیوی نے سسکیاں لیتے ہوئے ایک نہایت ہی رقّت آمیز لہجہ میں کہا "افسوس مجھ سے ایسی فاش غلطی عمل میں آئی اور میں تم سے جُدا ہوتے وقت آلے کے پیچ کو نرم کرنا بھول گئی" میں نے کہا خیر۔ جو ہونا تھا ہو گیا۔ شاید تم نہیں جانتیں۔ کہ اس گاڑی میں جو ہماری بازگشت کے وقت ہوٹل کے سامنے کھڑی تھی مسٹر گلبرٹ اور اُس کی بیٹی آئے تھے اور یہ لابدی ہے کہ میں مسٹر گلبرٹ سے فوراً ملاقات کروں چنانچہ وہ چرمی تھیلے کو لیکر اوپر چلی گئی اور میں مسٹر گلبرٹ کی تلاش میں نکلا۔ خوش قسمتی سے میں نے اس کو اُسکے کمرے میں پایا اور کہا کہ آپ سے خلوت میں کچھ کہنا چاہتا ہوں مسٹر گلبرٹ بادلِ ناخواستہ میری معیت میں ساتھ کے ایک کمرے میں جو اُس وقت خالی تھا چلے آئے میں نے یوں افتتاحِ کلام کیا "مجھ کو کسی ذریعہ سے جس کی تشریح کی اس وقت ضرورت نہیں یہ معلوم ہُوا ہے کہ آپ مجھ کو دیوانہ خیال کرتے ہیں اور اب اس کو میں اپنی زندگی کا اہم ترین مقصد خیال کرتا ہوں کہ آپ کے سامنے اپنی صفائی پیش کروں" یہ کہہ کر میں نے اپنی ایجاد کی تمام سرگذشت اس کے سامنے من و عن بیان کی اور ان افعال کی نوعیت کو بھی سمجھایا جن کی وجہ سے وہ مجھے مجنون تصور کرنے لگ گئے تھے۔ مگر جو واقعہ کہ اس شام کو رونما ہو چکا تھا اس کا میں نے کوئی ذکر نہ کیا۔

مسٹر گلبرٹ جواب میں کہنے لگے "آپ کی اہلیہ محترمہ بھی تو یہاں ہیں" میں نے کہا "بیشک۔ وہ میرے بیان کی حرف بحرف تصدیق کرینگی" چنانچہ وہ آئی اور جو کچھ میں کہہ چکا تھا چونکہ وہ سراسر درست تھا لہذا اُس نے از خود اسی کو لفظ بلفظ دہرایا۔ یوں تو مسٹر گلبرٹ کو میری صداقت کا یقین ہو چکا تھا مگر شاید فرطِ استعجاب سے اُنھوں نے فرمایا "اگر ایک ایسی طاقت کا جس کا ذکر آپ فرماتے ہیں۔ وجود ممکن ہے تو بہتر ہے کہ آپ اس کا ثبوت پیش کرکے میرا اطمینان کر دیں" میں نے کہا "بہت خوب۔ میں اس کا ثبوت آسانی سے ابھی پیش کر سکتا ہوں۔ آپ ہمارے کھانے کے اختتام تک انتظار فرمائیں" چنانچہ رات کے کھانے سے فارغ ہو کر میں اوپر گیا اور اپنا جھولا لے کر مسٹر گلبرٹ کے پاس واپس آیا۔ اپنا آلہ ان کو دکھایا اور اس کی ساخت کے اصول کی بھی تفصیل کر دی۔ اور کہا کہ اگر آپ میرے ساتھ باہر چلیں تو میں آپ کو بتا سکونگا کہ کس طرح اس سے کام لیا جاتا ہے۔ مسٹر گلبرٹ بولے کہ یہی ایک بات ہے جس کو دیکھنا چاہتا ہوں اب وہ میرے ساتھ ہو لئے۔ میدان میں پہنچکر رات کی تنہائی اور سناٹے میں میں نے اپنا جھولا اُن کی پشت پر کس دیا۔ اور پیچ کو ڈھیلا کرنا تھا کہ مسٹر گلبرٹ باوجود اپنی فربہی اور وقار کے ایک مدت العمر کے بعد حسب دلخواہ لگے اِدھر اُدھر اُچھلنے، کودنے اور پھلانگنے۔ ان پر ایک عجیب فرحت اور بہجت کا عالم طاری تھا۔ بچپن کے بعد شاید یہ سبک خرامی کبھی انہیں نصیب نہ ہوئی تھی۔ ان کے ارشاد کے مطابق میں نے پیچ کو قدرے اور نرم کر دیا۔ پھر تو مسٹر گلبرٹ کمال آسانی سے ایک چھ فٹ بلند دیوار پر سے پھلانگ گئے۔ اور جب فضا میں دل بھر کر تفریح ہو چکی تو واپس ہمارے پاس آئے اور فرمایا کہ اسے اُتار لیجئے۔ ورنہ میں عمر بھر اس کی خواہش کی غلامی کرونگا۔ اور لوگ مجھے دیوانہ سمجھیں گے۔ اور تعجب نہیں کہ پاگل خانے کی ہوا کھانی پڑے۔

میں نے تھیلے کو اُن کی پیٹھ سے اُتار لیا اور کہا کہ آپ اب میری ان لمبی سیروں کا فلسفہ سمجھے کیا اب آپ پر یہ راز کھلا کہ میں کس طرح بلندیوں پر بلا تکان آن کی آن میں چڑھ جاتا ہوں اور کس طرح میرے اس کوتاہ قامت مریل گدھے نے اس پتھروں سے بھری ہوئی گاڑی کو کھینچ لیا تھا؟ جس کے جواب میں انھوں نے فرمایا کہ "ہاں اب میں نے خوب سمجھ لیا۔ لہذا جو کچھ میں نے گذشتہ میں کہا اور کیا۔ اس کو واپس لیتا ہوں معذرت کے ساتھ" یہ الفاظ اُن کی زبان سے سُن کر میری بیوی بول اُٹھی "کیا اب میرا ہربرٹ جینٹ سے شادی کر سکیگا؟" مسٹر گلبرٹ نے جواب دیا "کر سکیگا! لازماً کریگا۔ اور اس آلہ کے متعلق میرا خیال ہے کہ آپ کا فرض ہے کہ اسے عام کر دیں جس کے پاس بھی یہ ہوگا وہ اسے استعمال کرنے سے کبھی باز نہیں رہ سکیگا۔ لیکن اگر یہ پہلے کی طرح آپ کی شخصی ملکیت ہی رہا تو یاد رکھئے عامۃ الناس آپ کو مجنوں خیال کرنے سے کبھی نہیں رکیں گے اور عوام کی نظروں میں مجنون سمجھا جانا در اصل ایسا ہی بُرا ہے جیسا کہ حقیقتاً مجنون ہونا" جواب میں میں نے کہا "میرے دوست میں اس خصوص میں ایک

حتمی فیصلہ کر چکا ہوں یہ آلہ جو کہ میرے لئے ماضی میں ایک بے نظیر برکت کا سرچشمہ رہا ہے لیکن جیسے کہ مجھے اب معلوم ہو گیا یہ ہمارے لئے بے حد نقصان اور رُسوائی کا موجب بھی ہُوا - اس کا راز اب صرف ہم تین افراد تک محدود ہے سو ہم اس کو تا حینِ حیات راز ہی رکھینگے - مگر یہ ایجاد خود ایسی خطرناک ہے کہ اس کو پاس رکھنا اور عمل میں لانا گویا عزت و ناموس سے ہاتھ دھونا ہے ۔ چنانچہ میں نے معاً تھیلے کے پیچ کو سارے زور سے کس دیا اور تھیلے کو ہوا میں چھوڑ دیا - ایک لمحہ میں وہ اُوپر کو چڑھا اور بالائی فضا کی تاریکیوں میں گم ہو گیا - میں خاموش تھا - مگر میری بیوی دفورِ جوش میں مجھ سے لپٹ گئی اور چلائی کہ اب آپ دوسرا تو نہیں بنائینگے؟ میں نے کہا کہ ہرگز نہیں -

ہربرٹ میری اور مسٹر گلبرٹ کی مشترکہ دعوت پر جرمنی سے ہمارے پاس پہنچ گیا اور محبت و اُمید کی وہ کلیاں جو مرجھا کر رہ گئی تھیں - مژدۂ عروسی کی تازہ بہاریں پھر سرسبز و شاداب ہو کر چمنستانِ زندگی میں لہلہانے لگیں - میرا ایمان ہے کہ اس روز ہربرٹ اور جینٹ جیسے دو مسرور انسانوں کا دنیا میں دستیاب ہونا ناممکن تھا -

میں مانتا ہوں کہ سرعتِ رفتار کے دیوتا کی طرح زمین پر اچھلتے کودتے اور دوڑتے پھرنا اور قوتِ جاذبہ کی عذابناک پابندیوں سے جو ہمارے اجسام کو زمین کی طرف کھینچ کر اُن کی نقل و حرکت کو تکان و تعب و نقاہت کا موجب بنا دیتی ہے آزاد ہونا انسانی آسائش اور مسرت کا ایک حقیقی معجزہ ہے - لیکن یہ تمام آسائش اور مسرت اُس طمانیت اور اطمینانِ قلب کے سامنے خاک بھی نہیں جو دو نوجوان اشخاص کے سرشارِ محبت دلوں کی ایک ایسی مفارقت کے بعد جسے وہ دائمی تصور کر چکے ہوں باہمی ملنے سے حاصل ہوتی ہے -

میں نہیں کہہ سکتا کہ میری بیوی کی اس لوگری اور میرے جھولے کو بالائی طبقاتِ ہوا میں کیا کچھ پیش آیا اور آیا وہ کبھی ایک دوسرے سے ملاقی ہوئے یا نہیں لیکن اگر وہ تا ابد اس دنیا سے دُور رہ کر اُوپر کو ہی چڑھتے رہیں تو میں یقیناً بہت مطمئن رہونگا -

رہی یہ بات کہ دنیا کبھی جاذبۂ منفی کے مسئلے کو حل کر سکیگی یا نہیں - سو اس کا دار و مدار کلیتاً میرے بیٹے ہربرٹ کی اُفتادِ مزاج پر ہے - جو اب سے سالہا سال بعد جب میں پیوندِ خاک ہو چکا ہونگا اُس بستے کو کھولیگا - جو اب میرے قانونی مشیر کے پاس ہے +

(ترجمہ)

عبدالرحمٰن

آ آ اِدھر آ میری پیاری ، بے مثل خوبصورت ترین محبوبہ! ہم دونوں ملکر اُس خوشگوار مرغزار میں سیر کریں ،
جہاں لالے اور نرگس کے حسین پھولوں پر آنکھیں شوق سے جھک جاتی ہیں ، اور جہاں تیرے خوبصورت
سنہری بالوں سے ہوا اٹکھیلیاں کرتی ہے -

آ اپنی معصوم آنکھوں اور گھر کے بُنے ہوئے سوت کے کپڑوں کے ساتھ ریشم اور کمخواب کا لباس اتار پھینک -
اس خوش گوار سبزہ زار میں
جہاں بید ، سرکنڈے اور جنگلی پھول نرم نرم ہواؤں کے ساتھ رقص کرتے رہتے ہیں ،

آ اپنے قدرتی سنوارے ہوئے بالوں کے ساتھ ، چمکدار آنکھوں ، اور عریاں پیشانی کے ساتھ ،
آ اُس خوشبودار جھاڑیوں ، اور جنگلی گلاب کے سبزہ زار میں جہاں خوابوں کی شیرینی محوِ آرام ہے ،
آ ہم بھی ان میں بیٹھ کر اُلفت کے مزے لیں

(جان کلیر)

طاہر قریشی

لایزال

ادا ہم کو خوش آتی ہے ہمیشہ رہنے والے کی ابد تک بات جاتی ہے ہمیشہ رہنے والے کی

مہ و انجم میں بجلی میں فلک میں مہر انور میں ادا جلوے دکھاتی ہے ہمیشہ رہنے والے کی

سوا میرے کسی کو گر جو چاہا تو مٹا دوں گا رضا ہم کو بتاتی ہے ہمیشہ رہنے والے کی

بنا کر زرد رو ہم کو کیا ہے سرخرو آخر محبت رنگ لاتی ہے ہمیشہ رہنے والے کی

چمن زار ابد کا اس نے مالک کر دیا ہم کو تمنا گل کھلاتی ہے ہمیشہ رہنے والے کی

کنار آبجو کہسار پر گلپوش وادی میں
یکایک یاد آتی ہے ہمیشہ رہنے والے کی

ح - ب

وادیٔ چناب کی ایک شام

اک طرف کہسار ہیں شاداب اور رفعت نشاں
دوسری جانب ہے اک دریا خموشی سے رواں

اک طرف یہ اوج و شوکت یہ مناظر دلفریب
دوسری جانب کنارِ بحر میداں کا نشیب

کوہ کے دامن میں جاکر چھپ رہا ہے آفتاب
یا طلائی رنگ سے لبریز ہے آبِ چناب

رفعتِ کہسار بھی اور آبِ دریا بھی خموش
سبزۂ ساحل بھی ساکت اور صحرا بھی خموش

وادیاں سنسان ہیں بزمِ چمن بھی ہے خموش
پھول اور کلیوں کی رنگیں انجمن بھی ہے خموش

کوہ کی چوٹی سے ہے تخلیقِ تصویرِ ہلال
اور اک چھوٹا سا تارا حاشیہ گیرِ ہلال

جیسے اک خاموش دوشیزہ برائے سیرِ شام
کر رہی ہو اپنی جلوہ ریزیوں کا اہتمام

کاروانِ شب اُفق سے ہر طرف بڑھتا ہُوا
اک اندھیرا سا سوادِ کوہ پر چڑھتا ہُوا

محشرِ نظارہ تابِ دید لا سکتا نہیں
دیکھ تو سکتا ہے اوروں کو دکھا سکتا نہیں

چاند بن سکتا ہے چشمِ شوق کا تارا کہیں
سیر ہو سکتا ہے اس منظر سے نظارہ کہیں

چاہتا ہے دل کہ ہم بھی بس رہیں آکر یہیں
اس سکوں آباد میں کچھ روز ہو جائیں مکیں

رازِ تسکیں ہے سکوتِ بحر کے پیغام میں
یا وقارِ کوہ یا حسنِ خموشِ شام میں

رُخ نظر آتا ہے روشن گردشِ ایام کا
آفتابِ صبح سے مجھ کو [illegible] کا

[illegible]

جھونپڑی

جس روز بھوک اور پیاس سے بے کل اس دبلے پتلے نوجوان کو منٹو پارک سے پکڑ کر وہ گھر لائی تو ردھیا نے بھول کر بھی نہ سوچا تھا کہ وہ اسے اپنا سب کچھ نذر کر دے گی۔ لوہاروں کی نیچ قوم کی ایک الھڑ لڑکی کا ایک اُونچے خاندان کے چھتری سے بیاہ ہی کیا؟ لیکن محبت نے ذات پات کے سب بندھن توڑ ڈالے۔ ردھیا اس بن ماں باپ کے نوجوان کی ہنستی ہوئی آنکھوں کا شکار ہو گئی۔ چھوٹی راوی کے کنارے لوہاروں کی ایک چھوٹی سی بستی تھی۔ اس میں ردھیا کی بستی تھی۔ وہیں شیامو اور وہ رہنے لگے۔

بستی میں ایک ہلچل سی مچ گئی۔ پرانے خیالات کی گود میں پلی ہوئی بستی اپنی ایک لڑکی کو اس طرح ایک اجنبی کے ہاتھ میں جاتے دیکھ کر بے طرح بگڑ اُٹھی۔ کیا برادری میں اس کے لئے لڑکے نہیں تھے؟ کیا برادری کے بیسیوں نوجوان ردھیا سے بیاہ کی آس لگائے نہیں بیٹھے تھے؟ مختصر یہ کہ ان دونوں کے خلاف زبردست شور و غل برپا ہُوا۔ اس کا اندازہ تو ردھیا کو بیاہ سے پہلے ہی ہو گیا تھا۔ لیکن اس نے اس طرف ذرا بھی دھیان نہ دیا۔ اس نے سوچا تھا دو چار روز بک جھک کر یہ لوگ اپنے آپ چپ ہو جائینگے۔ پریم کی مستی میں وہ اپنی بستی کو جانتے ہوئے بھی بھول گئی۔

دن پر دن گذرتے گئے۔ لیکن لوگوں کا شور و غل کم نہ ہُوا۔ ردھیا کو برادری کے پرانے قانون کو توڑنے کی معافی نہ ملی۔

اس نے بھی انتہائی بہادری سے مقابلہ کیا۔ لیکن پوری بستی کے سامنے اکیلی لڑکی کتنے دنوں تک ٹھیر سکتی تھی؟ آخر ردھیا ہار گئی۔ ایک روز جھونپڑی میں پانی کا گھڑا لئے گھستے ہوئے اس نے کہا "اب نہیں سہا جاتا ......"

بیاہ کو ابھی پورا سال نہیں ہُوا تھا۔

شیامو ردھیا کی بنائی ہوئی قینچیاں چاقو وغیرہ تھیلے میں ڈال رہا تھا۔ اس نے ردھیا کی بات سنی تو تھیلا وہیں چھوڑ کر اُٹھ کھڑا ہُوا اور بولا "کیوں؟ کنوئیں پر آج پھر کوئی جھگڑا ہُوا؟"

ردھیا نے اس کے سوال کا کوئی جواب نہیں دیا۔ پانی سے چھلکتا ہُوا مٹی کا گھڑا کمرے سے نیچے رکھتے ہوئے بولی "یا تو مجھے اس بستی سے دُور کہیں لے چلو۔ یا ......" اس کے آگے وہ کچھ نہ کہہ سکی۔ اس کی آنکھوں سے آنسو بہ نکلے۔

"تجھ کو یہاں چھوڑ کر میں اپنی راہ لوں ......" شیامو نے ردھیا کا ادھورا جملہ پورا کیا۔

ردھیا چپ رہی۔ وہ کہہ ہی کیا سکتی تھی۔ کچھ دیر ٹھیر کر شیامو نے پوچھا "میرے جانے سے کیا شور و غل بند ہو جائیگا؟"

"ہو سکتا ہے" ردھیا نے دبی ہوئی آواز سے کہا۔

شیامو نے بحث بند کر دی اور کھڑا ہو کر دیر تک ٹکٹکی لگائے اپنی پتنی کو دیکھتا رہا۔ پھر تھیلا اٹھا کر جھونپڑی سے باہر نکل آیا۔

بازار کی طرف مُنہ تو کر دیا۔ لیکن پاؤں بڑی مشکل سے اُٹھ رہے تھے۔ جس کے دل میں کہرام مچ رہا ہو وہ کیسے گلی گلی چاقو اور قینچیاں بیچتا پھرے؟

بستی سے کچھ دور شہر کے قریب آم کا ایک پرانا درخت تھا۔ شیامو اسی کے نیچے بیٹھ گیا۔ سامنے شہر میں شور و غل ہو رہا تھا لوگ اپنے گھروں سے آ رہے تھے۔ کچھ گھروں میں جا رہے تھے۔ وہ سوچنے لگا "کیا اتنے بڑے شہر میں اسے پانچ چھ گز زمین نہیں مل سکتی۔ جہاں یہ اپنی پتنی کو لے جا کر چھپے؟ اور اس بستی کی دُکھ بھری زندگی سے چھٹکارا پا جائے۔ لیکن اسے کہاں جگہ مل سکیگی؟ وہاں تو انچ انچ بھر زمین پر ملکیت کی مُہر لگی ہوئی ہے۔ اس نے چاروں طرف نظر دوڑائی۔ لیکن اسے کوئی ایسا بھی نظر نہ آیا جو دو ہی چار دن کے لئے اسے امان دے دیتا۔ وہ سوچنے لگا۔ اب تو ردھیا کے بتائے ہوئے دوسرے راستے پر اسے چلنا ہی ہوگا۔

محبت نے ایک دو بار تو اُس کے پاؤں میں بیڑی ڈالنے کی کوشش کی لیکن کامیاب نہ ہو سکی۔ شیامو نے اسی روز بستی چھوڑنا طے کر لیا۔

شام کو بستی میں جب اُس کی راہ دیکھی جا رہی تھی تو وہ اسٹیشن

والی سڑک پر تھا۔

× × × × × × × × × × × × × ×

روصیا کا خیال ٹھیک نکلا۔ شیامو کو گئے ہوئے ابھی چھ ہی مہینے ہوئے تھے کہ شور وغل دب گیا۔ جب بانس ہی نہ رہا تو بانسری کیا بجتی؟ روصیا آہستہ آہستہ بستی میں اپنی کھوئی ہوئی جگہ حاصل کر رہی تھی۔

لیکن خوشی اس سے کوسوں دُور تھی۔ دل اداس اور بےچین تھا۔ پریتم کے ساتھ رہتے ہوئے روز کے جھگڑوں والی زندگی اس پرسکون اور بےکیف زندگی سے کتنی اچھی اور کتنی پیاری تھی؟ یہ اس نے اب جانا۔ آہ! گزرے ہوئے دن اب نہ لوٹ سکتے تھے؟ پتی سے بچھڑ کر رہنا اتنا کٹھن ہے اگر اسے اس کا اندازہ پہلے ہوتا تو وہ شیامو کو جانے کے لئے اتنا مجبور نہ کرتی۔ وہ اب سچ مچ اپنے کئے پر پچھتا رہی تھی۔

لیکن اب کیا ہو سکتا تھا؟ شیامو نے تو جا کر ایک چٹھی تک نہیں لکھی۔ روصیا کو تو یہ بھی پتہ نہ تھا کہ وہ ہے کہاں؟ ہاں اتنا سنا تھا کہ تین مہینے پہلے وہ کلکتہ میں تھا۔ اس کی بستی کا ایک سردار کچھ دن ہوئے وہاں سے واپس آیا تھا۔ اس نے روصیا کو یہ بتایا تھا۔ لیکن اُس نے یہ بھی کہا تھا کہ شیامو کچھ ہی دنوں میں برہما جانے والا تھا۔ اب وہ برہما پہنچ چکا ہوگا۔ اور کون جانے وہ وہاں سے اور بھی آگے نکل گیا ہو۔

بات سچ مچ یہی تھی۔ شیامو اُس وقت برہما سے بہت دُور افریقہ میں ٹھیکہ داری کر رہا تھا۔

× × × × × × × × × × × ×

پندرہ برس گذر گئے۔

کچھ دنوں تک تو روصیا کو شیامو کے لوٹنے کی امید رہی۔ اور وہ انتظار کی گھڑیاں گن گن کر گزار رہی تھی۔ لیکن جوں جوں وقت گزرتا گیا اُمید کی روشنی دُھندلی ہوتی گئی۔ آج وہ دھندلی روشنی بھی غائب ہو چکی تھی۔ شیامو کی یاد ایک گزرے ہوئے شیریں خواب کی طرح رہ گئی تھی۔ شاید اس ناامیدی کی وجہ سے اب اُس کے دل کو ایک حد تک سکون تھا۔

لیکن اُسے فکر کرنے کی فرصت ہی کہاں تھی؟ صبح سے لیکر شام تک اُس کی جھونپڑی بستی بھر کے بچوں کی تفریح گاہ بنی رہتی تھی چارپائی سے اُٹھ کر آنکھیں ملتے ہوئے بچے دانے دُنکے کی اُمید میں روصیا بہن کی جھونپڑی میں آنے شروع ہو جاتے تھے اور دن بھر بغیر روک ٹوک آتے جاتے رہتے تھے۔ روصیا کا دن بچوں کے چھوٹے چھوٹے کام کرتے اور اُن سے کھیلتے ہوئے دم بھر میں گزر جاتا تھا۔ کتنی مُرمی کتنی پیاری زندگی تھی؟ اس کی زندگی کا بہاؤ کتنا دلکش تھا؟ جیسے ایک چھوٹی سی نرمل اور سانت جل والی ندی چھوٹے چھوٹے گھنے درختوں کی چھاؤں میں شہر کے پاس لیکن شہر کی آنکھوں سے چھپ کر ہی چلی جا رہی ہو۔

لیکن یکایک ندی میں پُرشور لہریں اُٹھ پڑیں اس روز منگل تھا۔ روصیا سو کر اُٹھی ہی تھی۔ ابھی تک جھونپڑی میں کوئی بچہ نہیں آیا تھا۔ کسی نے اُس کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ اُس نے سر کا کپڑا ٹھیک کر کے کہا "آ جاؤ"!

ریشمی پگڑی۔ سونے کی طرح چمکتا ہوا اسلک کا کرتا سنہرا جوتا پہنے مسکراتا ہوا ایک شخص داخل ہوا۔ روصیا نے کچھ دیر تک اس کی طرف دیکھا۔ پھر چونک کر اُٹھ بیٹھی۔ پھر تعجب اور خوشی سے بھری ہوئی آواز میں بولی "تم ——— ؟"

"ہاں! میں!"

شیامو نے دروازے کی کنڈی چڑھا کر روصیا کی طرف دونوں بانہیں پھیلا دیں۔ روصیا تیر کی طرح اُڑ کر اُس کے سینے سے جا چمٹی۔

کچھ دیر کے بعد جب شیامو اس کے آنسو محبت کے بوسوں سے سکھا چکا تھا۔ روصیا نے پوچھا "کب آئے؟"

"پچھلے سال"۔

"پچھلے سال؟" روصیا اپنے آپ کو اُس سے چھڑا کر دو ایک قدم پیچھے ہٹتی ہوئی طنز سے بولی "تو مجھ سے ملنے کی فرصت آج ملی ہے؟"

"ہاں"! شیامو نے بھاری آواز میں جواب دیا "کل ہی مکان تیار ہوا ہے۔ اور آج تجھے لے چلنے کے لئے یہاں آیا ہوں"۔

روصیا نے کچھ جواب نہ دیا۔ شیامو کے پاس ہی چارپائی پڑی تھی۔ اس پر بیٹھتا ہوا شیامو پھر کہنے لگا "جس چیز کو ڈھونڈھنے کے لئے پندرہ برس پہلے گھر سے نکلا تھا۔ اُس کے بغیر تمہیں کیسے مُنہ دکھا سکتا تھا؟ لیکن یہ سال میں نے جیسے کاٹا ہے۔ وہ میں ہی جانتا ہوں۔ پردیس کی اور بات تھی۔ لیکن یہاں آ کر تم سے دور رہنا بڑا

کٹھن تھا "

رودھیا کی ساری ناراضگی جاتی رہی - وہ چپکے سے اپنے پتی کے پاس چارپائی پر جا بیٹھی -

" اٹھو چلیں " شیامو نے کہا " باہر موٹر کھڑی ہے "

" ابھی ؟ " رودھیا جھونپڑی کے چاروں طرف دیکھنے لگی -

" اسے کیا دیکھتی ہو " شیامو غرور سے بولا " اس سے بڑے بڑے کمرے تو ہمارے نئے مکان میں نوکروں کے ہیں "

رودھیا ذرا مسکرائی - وہ شیامو کو کیسے بتاتی کہ وہ پھوس کی جھونپڑی اس کے لئے کیا تھی - آخر رودھیا جانے کے لئے اٹھ کھڑی ہوئی -

" یہاں سے کپڑے لے چلنے کی ضرورت نہیں - وہاں سب کچھ ہے " یہ کہتا ہوا شیامو رودھیا کو لئے ہوئے جھونپڑی سے باہر ہو گیا جھونپڑی میں تالا لگا کر رودھیا موٹر میں جا بیٹھی - شوفر تیار ہی بیٹھا تھا موٹر تھوڑی ہی دیر میں چل دی -

رودھیا نے مڑ کر دیکھا - بچوں کا پہلا جھنڈ اس کی جھونپڑی کی طرف جا رہا تھا - روکتے روکتے بھی اس کے منہ سے ایک ٹھنڈی سانس نکل گئی -

× × × × × × × × × × ×

مکان میں قدم رکھتے ہی اس کی حیرت کا ٹھکانا نہ رہا - ہر کمرے میں سنگ مرمر کا فرش - دیواروں پر لگی ہوئی اعلیٰ درجہ کی تصویریں اور چھتوں میں لٹکتے ہوئے بلوریں جھاڑ فانوس دیکھ کر وہ ششدر رہ گئی - شیامو کے پیچھے وہ کٹھ پتلی کی طرح کمرے دیکھتی ہوئی چلی جا رہی تھی - ایک کمرے میں گھستے ہوئے اس کے پتی نے مسکرا کر کہا " یہ تمہارا خاص کمرہ ہے "

رودھیا نے چاروں طرف دیکھا - ایک کونے میں ایک بڑے آئینے والی ڈریسنگ ٹیبل پڑی ہوئی تھی - اور اس کے سامنے دیوار سے لگی ہوئی ساگوان کی ایک بڑی سی الماری رکھی ہوئی تھی - کمرے کے ایک طرف رنگین پلنگ پر مخمل کا بچھونا بچھا تھا - اور ادھر ادھر دو چار گ۔ے دار کرسیاں پڑی تھیں -

رودھیا یہ سازو سامان دیکھ کر اتنی متاثر ہوئی کہ کچھ کہنے کی خواہش ہوتے ہوئے بھی اس کی زبان سے کوئی لفظ نہ نکل سکا - صرف آنکھیں پھاڑ کر ایک بار اپنے پتی کی طرف دیکھ لیا -

" اس الماری میں تمہارے کپڑے ہیں " اس کے سوامی نے کہا " جلدی کپڑے بدل ڈالو - میں ابھی داسی کو بھیجتا ہوں "

وہ باہر نکل گیا - رودھیا کا دل اتنے بڑے تعجب کے بوجھ کو اٹھانے کے لئے بالکل تیار نہ تھا - اس لئے اپنے آپ کو سنبھالنا اس کے لئے ناممکن ہو رہا تھا - جب تک شیامو ساتھ تھا وہ کسی طرح اپنے آپ کو روکے رہی - لیکن اب اس بوجھ کو ہلکا کرنے کے لئے اس کا دل بے قرار ہو گیا - لیکن کرے تو کیا ؟ رونے کے سوا اسے کوئی چارہ ہی نظر نہ آیا - ایک کرسی پر بیٹھ کر آنسو بہانے لگی -

داسی کی آہٹ پا کر وہ جھٹ پٹ اٹھ بیٹھی - اور آنسو پونچھ کر پاس پڑے ہوئے کوچ پر بیٹھ گئی - داسی نے ہچکچاتے ہوئے مالکن کے پاؤں چھوئے - اور الماری کھول کر اس کے لئے کپڑے نکالنے لگی -

داسی اپنے کام میں ہوشیار تھی - چند ہی منٹ میں اس نے رودھیا کی کایا پلٹ دی - رودھیا کی نظر اتفاق سے سامنے آئینے پر پڑ گئی وہ متحیر رہ گئی -

اپنے آپ کو پہچاننا اس کے لئے مشکل ہو گیا - کہاں وہ میلے کچیلے ہاتھ کے بنے ہوئے کپڑے - اور کہاں یہ سونے کی طرح چمکتی ہوئی ولایتی سلک کی ساری ! رودھیا کا دل خوشی سے اچھل پڑا -

لیکن دو ہی دن میں اس کا سارا جوش و ولولہ جاتا رہا - اتنے اچھے کپڑے اور مکان - نوکروں اور نوکرانیوں کی فوج - بلائیں لینے والا پتی پا کر بھی اس کا دل اپنی جھونپڑی میں لوٹ جانے کے لئے تڑپنے لگا - بستی کی آزادی، وہاں کے کنوئیں کی گپ شپ، اور بچوں کی یاد آ آ کر اسے رلانے لگی - کبھی کبھی اس کا دل دھول میں لوٹنے کے لئے بیقرار ہو جاتا - لیکن اس مکان میں دھول کہاں ؟ اور پھر اتنے اچھے کپڑے پہن کر تو اسے سنگ مرمر کے فرش پر بھی بیٹھتے ہوئے ڈر لگتا تھا -

اس نے ایک بار محلے کے بچوں کو بلانے کی کوشش کی لیکن ایک تو وہاں پہنچتے ہی کم تھے - اور جو تھوڑے بہت تھے بھی ان کو گھر سے نکلنے کی اجازت نہ تھی -

برسوں آزاد رہنے کے بعد جو حالت ایک چڑیا کی پنجرے میں بند ہونے پر ہوتی ہے - ٹھیک وہی حالت رودھیا کی تھی - وہ بہت متفکر اور اداس رہنے لگی - شیامو اسے بہلانے کی کوشش تو بہت کرتا لیکن بیکار - رودھیا کا دل برابر تڑپتا رہا -

شیطان

بوداپسٹ کے کنوؤں کے قریب وہ زمین سے برآمد ہوا۔ اس کی آمد سے زمین پر ایک زلزلہ سا آیا اور سارا شہر ایک زبردست جھٹکے سے "وسے ب" ہوتے ہوتے رہ گیا۔ تند ہوا گندھک کے دھوئیں سے بھر گئی۔ بوداپسٹ کے لوگوں کو یقین ہو گیا کہ قیامت آ پہنچی۔

اس حیرت انگیز انقلاب کی حقیقت سے کوئی بھی واقف نہ تھا لیکن خوف نے اُن کی رگوں میں خون منجمد کر دیا تھا اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ یہ کوئی بہروں اور گونگوں کا شہر ہے۔ جونہی لوگوں کی نظریں شیطان سے دوچار ہوئیں وہ بے اختیار چیخ چیخ کر بھاگنے لگے۔

بعض کمزور دل کے آدمی دوزخ کے بادشاہ سے آنکھیں ملاتے ہی گھٹنوں کے بل گر پڑے اور منہ ہی منہ میں بھولی بسری عبادت کے ٹوٹے پھوٹے الفاظ دہرانے لگے۔ کُتے بھونکنے لگے۔ گھوڑے ہنہنانے لگے۔ ساری چیزیں خوف سے ساکت ہو گئیں جنگل کی درمیانی سڑک پل صراط کا نمونہ پیش کر رہی تھی۔ چھوٹے چھوٹے پرندے اور چڑیاں سڑک کی دونوں جانب مر کر گر گئیں۔ درختوں کے پتے سوکھ گئے۔ اور باغوں میں سارے پھول مرجھا گئے۔

شیطان اپنی گاڑی میں چلتا ہی رہا جس کو چار؟ دوزخی گھوڑے کھینچ رہے تھے۔ سامنے سُرخ سبز، زرد اور نیلے لباس والے ابن الشیاطین کودتے پھاندتے چلے جاتے تھے۔ بڑی عمر کے شیاطین سبز لباس پہنے سرخ ٹوپی اوڑھے منہ میں بگل لیکر گاڑی کے بازوؤں پر چل رہے تھے۔ گاڑی تخت نما تھی۔ جس پر شیطان جلوہ فرما تھا۔ اور خود ہی گھوڑوں کو ہانک رہا تھا۔ وہ بالکل خاموش تھا اور اس کے چہرے پر کسی نامعلوم غم کی جھلک تھی۔ اسی موقع کے حصول کے لئے اس نے تین صدی تک پابند سلاسل رہنا گوارا کیا تھا۔ اب وہ سارے شہر کا مالک تھا۔ صرف اپنی ایک چھینک سے وہ سارے شہر کو تباہ اور لوگوں کو ہوا میں گم کر سکتا تھا۔

شاہی تمکنت سے وہ آہستہ آہستہ چلتا رہا۔ جنگل سے گزر کر اس نے بازار کا رُخ کیا۔ اور بوداپسٹ میں داخل ہو کر گلیرٹ پہاڑ پر چڑھ گیا۔ آنکھ جھپکنے سے پیشتر اس کے ساتھیوں نے گلیرٹ کی انتہائی بلندی پر اس کے لئے ایک عالیشان محل تعمیر کر دیا۔ وسط شہر سے محل کی بلندی نہایت خوفناک دکھائی دیتی تھی۔

سارا شہر لرزاں تھا۔ لوگ خوف کے مارے قبل از وقت گھروں میں گھس پڑے۔ اور اُنہوں نے دروازوں کو تین تین چار چار قفل ڈالکر مضبوط کر لیا۔ دکانیں بند ہو گئیں۔ تھیٹروں پر سکوت چھا گیا اور آناً فاناً میں آمد و رفت قطعی طور پر بند ہو گئی۔

سارا شہر خاموش تھا۔ صرف کلیسا کی مدہم اور بے سر بجنے والی گھنٹیاں اس عالمگیر سکوت کو توڑ رہی تھیں۔ معبدوں میں پادری تھرّا رہے تھے۔ اور متقی لوگ رکوع کی حالت میں دعائیں مانگ رہے تھے۔

شیطان محل کے اگلے حصے میں ایک سنگین تخت پر شاہی وقار کے ساتھ بیٹھ گیا۔ اس نے اپنے ہاتھ موڑ لئے اور پیر سکیڑ لئے جس سے اُس کی شکل چمگادڑ کی سی ہو گئی۔ اس نے پھر اپنے ہاتھ پھیلا دئے۔ اور منہ کھول دیا۔ جس سے یہ ظاہر ہوتا تھا کہ گویا وہ سارے شہر کو بیک وقت نگل جائیگا یا کم سے کم پیس کر رکھ دیگا۔ اس کے بعد وہ مسلسل رات بھر عجیب بھیانک انداز میں ہنستا رہا۔

اس رات کسی نے آرام نہ کیا۔ صبح جب شیطان کی خوفناک ہنسی تھم گئی۔ تو لوگ بستر سے اُٹھ بیٹھے۔ امید و بیم کی کشمکش سے نجات پا کر آنکھیں کھلیں تو اُنہیں بے انتہا حیرت ہوئی جبکہ انہوں نے اپنے آپ کو زندہ پایا۔ اس سے انہیں بہت سا اطمینان ہو گیا۔ ان میں بعض بے پرواہ تھے انہوں نے خیال کیا کہ شیطان اتنا بدصورت نہیں جتنا کہ اُن کے تصور میں تھا۔ من چلے اور بہادر لوگ آہستہ آہستہ گلیوں میں داخل ہونے لگے۔ شیطان تخت ہی پر بیٹھا رہا۔ اپنا سر ہاتھوں میں لئے ہوئے وہ اس سوچ میں معلوم ہوتا تھا کہ گنہگار بندوں اور پاپ سے بھرے ہوئے شہر کے ساتھ کیا سلوک کرلے۔

کسی نے کہا "وہ کس قدر کریہ المنظر ہے" زیادہ لوگ دہشت
کی وجہ سے اس کی جسمانی ساخت پر نظر ہی نہیں ڈال رہے تھے مجمع
بڑھتا گیا۔

"وہ کیا بگاڑ لیگا" یہ کہہ کر تماشہ دکھلانے والے نے
اپنی تصویریں اور آئینہ پھیلا دئیے بہت سارے تماشہ بینوں نے
اپنے آئینوں کا رُخ شیطان کی طرف کر دیا کہ اس کے چہرے سے
اُس کے جذبات کا اندازہ کریں۔ وہ بدستور خاموش رہا اور فکر مند
معلوم ہوتا تھا۔ لوگوں کے اژدہام سے سڑکوں پر چلنے کے لئے راہ نہ
تھی۔ لوگ ایک دوسرے پر گرتے ہوئے شیطان کو دیکھ رہے تھے۔

بعض نے کہا "صورت سے تو یہ شیطان نہیں نظر آتا"
ورنہ وہ کبھی کا ہم کو لے گیا ہوتا یا کم سے کم کچھ نقصان تو پہنچاتا......
اگر شعبدہ باز اور بازی گر نہیں تو یہ کوئی اشتہاری پروپیگنڈا کرنے والا تو
ضرور ہے۔ تھوڑی دیر صبر کرو دیکھیں غازے یا منجن کے اشتہارات
بانٹتا ہے یا نہیں"

بعض اکتا کر گھروں کو واپس ہوئے۔ دوکانیں کھل گئیں ہوٹل
کھچا کھچ بھر گئے۔ کاروبار جاری ہو گیا ہر جگہ یہی تذکرہ تھا۔ ہر شخص
اپنی رائے کے ثبوت میں دلائل پیش کر رہا تھا۔ اکثریت کا یہی
خیال تھا کہ شیطان کا ارادہ کسی اور ہی جگہ جانے کا ہے۔ وہمیوں
کا یہ خیال تھا۔ کہ سارا شہر تباہ ہو کر رہیگا۔ وہ بدستور بیٹھا رہا۔
اور رات کی آمد کے ساتھ ہی وہ پھر ہنسنے لگا۔

ایک سوداگر نے قہوہ خانے کی ایک میز پر بیٹھے ہوئے کہا
"بڑا منحوس ہے" اس کے ساتھی اس پر ہنس پڑے ساری
رات خوفناک ہنسی کا سلسلہ جاری رہا۔ لیکن اب کسی نے اس
کی طرف توجہ نہ کی اور آرام سے سوتے رہے۔

صبح ہوئی لوگ جاگے۔ اخبارات دیکھنا شروع کئے تو پہلے
صفحے سے آخر تک صرف شیطان ہی کا تذکرہ تھا۔ ایسے ناقابلِ
حل سوالات کو پبلک کے فیصلے پر چھوڑ دیا گیا تھا کہ "اس کی آمد
کی اصل غایت کیا ہے"؟ ہونی چاہیے !

"اس کو اس طرح آنے کی کیوں ضرورت محسوس ہوئی؟ اس
کی ہنسی میں کیا اسرار پنہاں ہے" وغیرہ وغیرہ کالم کے کالم
انہیں مضامین سے بھرے تھے اور لوگ یہ معلوم کرنے کے لئے
بیتاب تھے۔ کہ شیطان کو سیدھا بوداپسٹ آنے اور یہاں مکان
تعمیر کرنے کی کیوں ضرورت محسوس ہوئی؟

اخبار والے اسی پر خاموش نہ رہے بلکہ صبح سے شام تک
گلیرٹ پہاڑ پر نمائندوں کا ایک تانتا لگ گیا۔ وہ کسی نہ کسی طرح شیطان
سے ملنا چاہتے تھے مگر نہ مل سکے۔ ناکام ہو کر وہ اس کے وزیر
ابوالمعاصی کی طرف متوجہ ہوئے۔ جب یہاں بھی دال گلتی نظر نہ
آئی تو اس کے کسی دربان سے ملنے ہی کو غنیمت سمجھا۔

دربان ان کی مطلب برآری کو دس کراؤن پر راضی ہو گیا۔
اس کا نام موریا تھا۔ موریا نے کہا کہ آج سہ پہر میں سرکارِ عالی وقار
کا ارادہ ہے کہ تفریح کے لئے شہر سے باہر تشریف لے جائیں
ایک گھنٹے کے اندر اخبارات نے خاص نمبر نکالے اور لوگوں کو
فوراً اس کی اطلاع مل گئی۔ شیطان کا اپنی گاڑی پر پہاڑ سے اُتر کر
نیچے پہنچنے سے پہلے سڑک کی دونوں جانب لوگ کھچا کھچ بھر گئے
تھے۔ جونہی ضلالت مآب کی گاڑی سڑک پر پہنچی بعضوں نے چیرز
اور بعضوں نے ہرّا سے ان کا خیر مقدم کیا۔ سلطنت کے کسی
معزز مہمان یا سفیر کی سواری معلوم ہوتی تھی۔

"وہ بہت بدصورت تو نہیں" لوگوں نے کہا۔

"کس قدر مردانہ صورت ہے" عورتوں نے بچوں کو بلند
کرتے ہوئے کہا کہ وہ بھی دیکھ لیں۔

شیطان ایک شریر بچے سے بھی زیادہ خوش تھا۔ دوپہر
میں شہر کی فضا کو خوشگوار پا کر اس نے ایک مؤقر اخبار کے نمائندے
کو بلایا۔ کہ اپنے خیالات کا اظہار کرے۔

اس نے کہا۔

"بنی آدم میری ہستی سے منحرف ہو گئے تھے۔ میری توقیر
مفقود ہو گئی تھی۔ میری عظمت خاک میں مل گئی تھی۔ میری آمد کی
اصل غایت یہ ہے کہ زمین پر دوبارہ میری شہنشاہی کا سکہ رواں
ہو۔ ابھی میں نے دکھا دیا ہے کہ میرے قبضے میں کیا کیا اختیارات
ہیں اس ہفتے کے آخر تک ظاہر ہو جائیگا کہ لوگ میرے متعلق
کیا رائے قائم کرتے ہیں" رات کی آمد کے ساتھ پھر وہ اسی طرح
ہنسنے لگا۔

بعضوں نے اعتراض کے طور پر کہا "بھلا اب وہ کیوں ہنس
رہا ہے"؟ ایک نے ناصحانہ انداز میں کہا "اس کو چاہیے کہ اپنی
اس بُری عادت کو فوراً ترک کر ڈالے" آخر وہ یہ فیصلہ کر کے

اپنے کاموں میں مشغول ہو گئے کہ "یا تو وہ مسخرا ہے یا اشتہار باز"۔

دوسرے دن بھی وہ سیر کے لئے باہر گیا لیکن تماشائیوں کی تعداد اب بہت ہی کم تھی ۔ اور آج انہوں نے کسی خوشی کا اظہار نہ کیا فکر کی تکان سے لوگ اسے بوڑھا کہنے لگے اور عورتیں بھی اس کو "ضعیف" کے نام سے یاد کرنے لگیں۔

بالآخر اس نے کہا "حیرت ہے ابھی تک لوگ مجھ سے تھرا رہے تھے اور ابھی میری صورت تک دیکھنا پسند نہیں کرتے؟"

اس ہفتے میں اس کے بعد ایک اور موقع ایسا آیا کہ لوگوں کی کافی تعداد نے شیطان کا خیر مقدم کیا۔ یہ موقع وہ تھا جبکہ اس نے اپنے اور اپنے ساتھیوں کے لئے تھیٹر کی اگلی نشستیں محفوظ کرائی تھیں۔ تماشہ نہایت بھدا اور بے لطف تھا پھر بھی اس نے ابتدا سے انتہا تک تالی بجانے کا سلسلہ جاری رکھا۔

اکتائے ہوئے تماشہ بینوں نے کہا "اس کی جسمانی حالت اس کے کمزور دماغ سے بھی خراب ہے"۔ دوسرے دن ایک ظریف اخبار نے اس کا کارٹون شائع کیا اور اس کی خوب ہنسی اڑائی ۔ اس کے ایک دن بعد اسی تھیٹر میں اس کا مذاق اڑایا گیا اور اس کی ہجویہ نظم پڑھی گئی۔ اور پانچویں دن کے آخر تک شہر میں ایک بھی شخص ایسا نہ تھا جس نے اس کی طرف کچھ خیال کیا ہو۔

ہفتے کے آخر پر اس نے کہا "میرا اختیار زائل ہو گیا ہے"

لوگ اس سے ڈرنے کے بجائے اس کا مضحکہ اڑاتے ۔ یہ دیکھ کر دوزخ کے سردار کو بے حد غصہ آیا۔ عالم غضب میں اس نے محل کو ایک ٹھوکر لگائی جو ایک بڑے دھماکے کے ساتھ دریائے ڈینیوب میں گر گیا۔ آسمان غبار آلود ہو گیا۔ زمین سیاہ ہو گئی اور ہوا گندھک کے شعلوں سے بھر گئی ۔ چھوٹے چھوٹے شیطان فضا میں اڑنے لگے ۔ جن کے منہ سے شعلے نکل رہے تھے اور یوں دکھائی دیتا تھا سارے شہر میں آگ کی چنگاریاں پھیل گئی ہیں ۔

لوگوں نے قہوہ خانوں میں کہا " ہم اس کی ترکیبوں سے خوب واقف ہیں "، غصے میں بھرے ہوئے ایک نوجوان نے یہاں تک جرأت کی کہ بازار میں نکل کر اس کے سامنے یہ کہہ کر چلانے لگا کہ

"میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ پولیس نے اس پاگل کو اس آزادی سے پھرنے کی اجازت [illegible]ردی ہے"؟

غمگین اور مایوس ہو[illegible] شیطان دوزخ کی طرف چل پڑا ۔

اور ۲۲۳۴ء میں جب تین صدیاں اور گزر گئیں۔ ادھر فرشتوں نے چاہا کہ اسے زنجیروں سے نکال کر ایک مرتبہ اور دنیا میں جانے کی اجازت دیں تو اس نے انکار کے لہجے میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔

"یہ مشغلہ بیکار ہے ۔ میں پھر زمین پر جانا نہیں چاہتا۔ دنیا میں عقل اور سمجھ کا مادہ ہی نہیں ۔ کیونکہ میں نے اس حقیقت کو بہت اچھی طرح سمجھ لیا ہے ۔ کہ بے وقوف انسان اسی پر یقین کریں گے جس کو وہ کبھی نہیں دیکھ سکتے"۔

سید ابوالفضل حیدرآبادی

اے دودھ دوہنے والی دوشیزہ، تو کہاں جا رہی ہے ؟ یہ تیری ٹوکری میں کیا ہے ؟

اے پری وش دوشیزہ، کیا تو ابھی ابھی شیر خانے سے آ رہی ہے ؟ کیا مجھے بھی تھوڑا سا مکھن دیگی ؟

میں تیرے پہاڑوں سے محبت کرتا ہوں، میں تیری وادیوں پر جان دیتا ہوں اور مجھے تیرے بھیں بھیں کرنے والے مویشی بہت ہی پیارے ہیں مگر آہ، کیا ہی اچھا ہو اگر ہم دونوں

دھڑکتے ہوئے دلوں کے ساتھ ان شرابی بیلوں پر لیٹ جائیں ۔

میں تیری ٹوکری کو احتیاط سے ایک طرف رکھ دوں اور تیری چادر کو بید کے ساتھ لٹکا دوں، اور پھر ہم گل نرگس کی کھلی آنکھوں کے نیچے آہیں بھرتے گھاس کی سرسبز بساط پر ایک دوسرے کو چومتے رہیں۔

(جان کیٹس)

طاہر قریشی

ساقی نامہ

پلا دے مجھے ساقیا ارغوانی — کہ رگ رگ میں بھر جائے جوشِ جوانی

غموں نے مری جان پر بار ڈالا — حوادث کے طوفان نے مار ڈالا

الم سے ہوئیں میری تاریک راتیں — گئیں بھول یکسر جوانی کی گھاتیں

نہیں چین دیتے یہ دنیا کے دھندے — لگے ہیں مجھے پھانس لینے کو پھندے

مرے دل کی دنیا ہے اُجڑی ہوئی سی — کہ تقدیر ہے میری بگڑی ہوئی سی

بہت اب تو غالب ہوئی ناتوانی — بہت اب تو دو بھر ہوئی زندگانی

وہ شے لا کہ ہو جائے جس سے اُجالا

مرے خانۂ دل میں ہو دیپ مالا

جو اندھوں کی آنکھوں کو بینائی بخشے — فسردہ دلوں کو توانائی بخشے

وہی نام لیتے ہیں جس کا گلابی — کبھی آفتابی - کبھی ماہتابی

وہ شے جس سے غم دور ہو جائیں سارے — وہ شے جس سے مسرور ہو جائیں سارے

غریبی میں دے جو مجھے پادشاہی — مبارک ہے وہ جس نے دولت یہ چاہی

جسے چاند نے اپنی گودی میں پالا — وہ شے جس کا ہے "دخترِ رز" نامِ اعلا

وہی جس سے مخمور آنکھیں ہیں تیری — سدا نشے میں چور آنکھیں ہیں تیری

وہ مے لا جو دم بھر میں بےخود بنا دے — پلا دے - پلا دے - پلا دے - پلا دے

شراب محبت ہے مرغوب مجھ کو

یہ ساحر حسینہ ہے مطلوب مجھ کو

دُنیائے اَدب

اُردو رسمُ الخط

ہندوستان میں زبان کا نہیں بلکہ ملکی اور قومی تنازعات کے سلسلہ میں اُردو اور ہندی رسم الخط کا جھگڑا ہے۔ مجھے ان اختلافات سے یہاں بحث نہیں ہے۔ بلکہ میں صرف علمی حیثیت سے یہ دکھانا چاہتا ہوں کہ اردو رسم الخط سے مسلمانوں کا تعلق دینی اور ملی لحاظ سے کس قدر اہم اور کتنا ناقابلِ شکست ہے۔

یہ امر تو بدیہی ہے۔ کہ اُردو رسم الخط عربی رسم الخط ہے۔ اہلِ فارس نے اسلام لانے کے بعد اپنے پرانے خط میخی کو چھوڑ کر جب عربی رسم الخط اختیار کیا تو چار حروف پ۔ چ۔ ژ اور گ اس پر بڑھا لیئے۔ ہندوستان میں آنے کے بعد مسلمانوں کی زبان سندھ میں کچھ زمانہ تک عربی رہی اور پھر مشرقی ہند پر قبضہ کرنے کے بعد سے فارسی ہوگئی۔ اُردو جب عالم وجود میں آئی تو اس کے لئے بھی وہی رسم الخط عربی رہا اور چند حروف ٹ۔ ڑ۔ ڈ ضرورت کے لئے اضافہ کر لئے گئے۔

عربی خط کی اشاعت میں امت اسلامیہ نے جو کوشش کی ہے وہ دنیا کی تاریخ میں بے نظیر ہے۔ میں تاریخی طور پر یہی دکھلانا چاہتا ہوں کہ دنیا کے مختلف ملکوں میں کس طرح عربی خط نے متمدن اقوام کے خطوط کو مٹا کر اُن کی جگہ لے لی اور کس قدر عظیم الشان غلبہ اس کو اقصائے عالم میں حاصل ہوا تاکہ مسلمانوں کو اپنے اس ملی اور دینی خط کی عظمت کا علم ہو جائے

دنیا کی کل زبانیں چار مختلف اقسام میں تقسیم کی جا سکتی ہیں:۔

(۱) سامی زبانیں۔ یعنی عبرانی۔ سریانی۔ نبطی۔ آرامی۔ کلدانی اور عربی وغیرہ جن کی زندہ قائم مقام اب صرف عربی ہے۔

(۲) اریرین یعنی ایرانی زبانیں۔ فارسی۔ کردی۔ پشتو۔ سنسکرت۔ ملائی۔ جاوی وغیرہ نیز یورپ اور امریکہ کی تمام زبانیں۔

(۳) تورانی زبانیں۔ ترکی۔ تاتاری۔ چینی اور جاپانی وغیرہ۔

(۴) حامی زبانیں۔ جو افریقہ میں بولی جاتی ہیں۔ مثلاً بربری۔ نوبی۔ حبشی وغیرہ۔

جس طرح ان زبانوں کے اقسام (گروپ) میں اصول لسانی کے لحاظ سے باہم فرق ہے۔ اسی طرح ان کے خطوط میں بھی تفاوت ہے۔

سامی خطوط کی خصوصیت یہ ہے کہ سب کے سب دائیں طرف سے لکھے جاتے ہیں۔

اریرین خطوط سب کے سب بائیں طرف سے۔

تورانی بھی متصل حروف کے ساتھ بائیں طرف سے لکھے جاتے ہیں لیکن بشکل عمود قائمہ۔

عربی خط کا ماخذ | مؤرخین کا بالعموم بیان یہ ہے کہ عربی خط سریانی خط سے نکلا ہے۔ جس کو خط سطرنجیلی کہتے ہیں۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ یہ دونوں خط باہم اس قدر مشابہ ہیں کہ بادی النظر میں ان کی ایک ہی شکل اور نوعیت معلوم ہوتی ہے۔ علاوہ بریں سریانی حروف کی ترتیب ابجد۔ ہوز۔ حطی۔ کلمن۔ سعفص قرشت پر ہے۔ ابتدا میں عربوں نے حروف تہجی کی ترتیب کو اسی نہج پر رکھا تھا چونکہ عربی میں چھ حروف نئے نکالے گئے تھے جو سریانی میں نہیں تھے۔ اس لئے دو لفظ ثخذ اور ضظغ اور بڑھا دیئے گئے۔

ان چھ زائد حروف یعنی ث۔ خ۔ ذ۔ ض۔ ظ۔ غ کے لئے عربوں نے نئی صورتیں نہیں اختراع کیں بلکہ انہیں کے ہم مخرج حروف کی شکلیں ان کے لئے مستعار لیں۔ اس طرح پر عربی حروف کی تعداد ۲۸ ہوگئی مگر ان کی شکلیں صرف ۱۷ رہیں۔ باہمی امتیاز کے لئے نقطوں سے کام لیا گیا۔

حرکات | اکثر زبانوں میں اعراب یعنی حرکات کے لئے حروف مقرر کئے گئے ہیں۔ جو حروف تہجی میں شمار ہوتے ہیں۔ اور سطروں میں لکھے جاتے ہیں۔ ان خطوط کے لکھنے میں محنت اور وقت دونوں زیادہ صرف ہوتے ہیں۔ اور جگہ بھی زیادہ گھیرتے ہیں۔ لیکن سامی خطوط میں حرکات کے لئے علامتیں ہیں۔ جو نیچے اوپر لگائی جاتی ہیں۔ اس میں آسانی یہ ہے کہ جہاں ضرورت سمجھیں ان کو استعمال کریں ورنہ چھوڑ دیں۔ یہی وجہ ہے کہ عربی کتابت ایک قسم کی مختصر نویسی ہوگئی ہے۔ دنیا کا کوئی خط اس قدر آسانی اور سرعت کے ساتھ کم وقت اور تھوڑی جگہ

میں نہیں لکھا جا سکتا جس قدر کہ عربی خط لکھا جا سکتا ہے۔

بعض ناواقف اور متعصب لوگوں کی زبان سے اس خط پر یہ اعتراض سننے میں آیا ہے کہ اس میں حروف اور الفاظ کی باہمی مشابہت سے پڑھنے میں دشواری پیش آتی ہے۔ نیز حرکات کے لئے چونکہ حروف متعین نہیں ہیں۔ اور صرف علامتوں سے کام لیا جاتا ہے۔ اس لئے ان میں سہل نگاری ہو جانے کی وجہ سے عبارت پڑھنے میں غلطیاں ہوتی ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ کوئی وزنی اعتراض نہیں ہے۔ حروف کے باہمی امتیاز کے لئے نقطے مقرر ہیں اور حرکات کے لئے علامتیں۔ علاوہ بریں یہ معترضین نقطوں اور حرکتوں کو جس قدر ضروری سمجھتے ہیں۔ اس قدر واقع میں وہ ضروری نہیں ہیں۔ ہم میں سے ہر شخص کتابوں اور اخباروں نیز خطوں اور نوشتوں کی اردو عبارت صحیح صحیح نہائت آسانی اور تیزی کے ساتھ پڑھ لیتا ہے۔ حالانکہ نہ ان میں نقاط کی پابندی کی جاتی ہے۔ نہ حرکات کی۔ آج ہزار ہزار برس کی لکھی ہوئی کتابیں عربی کتب خانوں میں موجود ہیں۔ جن کو لوگ شروع سے آخر تک صحیح پڑھ لیتے ہیں۔ اس سے بڑھ کر اس خط کے مکمل ہونے کی اور کیا دلیل ہو سکتی ہے۔

عربی خط حجاز میں | اسلام سے پہلے ملک عرب میں اہل حجاز خاص طور پر فن کتابت سے ناآشنا تھے۔ کیونکہ ان کی سادہ زندگی میں لکھنے پڑھنے کی ضرورت ہی نہیں پڑتی تھی۔ البتہ ان کے ارد گرد جو عربی قومیں آباد تھیں۔ ان میں فی الجملہ تمدن ہونے کی وجہ سے کتابت رائج تھی۔ چنانچہ شمال میں نبطی قومیں خط نبطی میں اور اہل یمن خط مسند میں کتابت کرتے تھے۔ اہل حجاز چونکہ شام۔ عراق اور یمن میں تجارت کی غرض سے آتے جاتے تھے۔ اس لئے انہوں نے بھی اپنی تجارتی ضرورت سے حساب وکتاب رکھنے کے لئے ان قوموں سے لکھنا سیکھ لیا تھا۔ مورخین کا بیان ہے کہ حجاز میں سب سے پہلے حضرت ابوسفیان نے جو مکہ کے ملک التجار تھے۔ کتابت سیکھی تھی لیکن اس زمانہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دادا عبد المطلب شیخ الحرم کے ہاتھ کا بھی ایک نوشتہ ملا ہے۔ جس سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ وہ بھی لکھنا جانتے تھے۔

عربی خط اور اسلام | حجاز میں اگرچہ چند افراد کتابت سے آشنا تھے جن کی تعداد بلاذری کے بیان کے مطابق سترہ نفوس پر مشتمل تھی جن میں سے دو عورتیں تھیں لیکن بالعموم وہاں کے باشندے امی (ناخواندہ) تھے۔ چنانچہ قرآن میں اسی لفظ کے ساتھ وہ متصف کئے گئے ہیں "ہو الذی بعث فی الامیین رسولاً منہم"۔ ظہور اسلام کے بعد سے عربی خط کا ستارہ بلند ہونا شروع ہوا جس کا اصلی باعث قرآن کریم ہے۔ کیونکہ پہلی وحی جو رسول امی صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوئی یہ تھی:۔

اقرا وربک الاکرم الذی علم بالقلم۔ | پڑھ اور تیرا رب سب سے بزرگ ہے جس نے علم سکھایا قلم کے ذریعے سے۔

دوسری سورت میں اللہ تعالٰے قلم اور نوشتوں کی قسم کھا کر کہتا ہے۔

"ن۔ والقلم وما یسطرون"

اسلام کے ساتھ ہی ساتھ عربی خط کی بھی اشاعت شروع ہوئی۔ کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خود وحی آسمانی اور ان خطوط کو لکھنے کے لئے جو غیر ملکوں کے بادشاہوں اور امراء کو بھیجے جاتے تھے۔ کاتبوں کی ضرورت تھی۔ چنانچہ حجاز میں سب سے پہلے جس نے عام طور پر خط کی اشاعت کی کوشش شروع کی۔ وہ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تھے۔ آپ کی خواہش یہ تھی کہ امت عربیہ میں بالعموم کتابت کو رائج کر دیں۔ اس کی شہادت اس واقعہ سے بھی ملتی ہے۔ کہ جنگ بدر میں جو اہل مکہ اسیر ہوئے تھے۔ ان میں سے جن کو لکھنا آتا تھا۔ اور وہ اپنا فدیہ نہیں ادا کر سکتے تھے۔ ان سے آپ نے فرمایا کہ وہ مدینہ کے دس دس بچوں کو لکھنا سکھا دیں اور آزاد ہو جائیں۔

خلفائے راشدین اور بعض دیگر صحابہ کبار رضی اللہ عنہم کتابت جانتے تھے۔ وہی لوگ وحی قرآنی اور آنحضرتؐ کے خطوط لکھتے تھے۔ اکثر صحابہ نے حضور اکرم کا رجحان طبع دیکھ کر زمانۂ اسلام میں کتابت سیکھی اور بتدریج مسلمانوں میں اس کا رواج ہو چلا۔ یہاں تک کہ مدینہ میں بعض بعض عورتیں بھی کتابت کرنے لگیں۔ خود ام المومنین حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا لکھ پڑھ سکتی تھیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد خلفاء نے نشر خط کی تحریک جاری رکھی۔ جب حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے مصاحف لکھوا کر مختلف صوبوں میں بھجوائے۔ تو اہل قلم اس کی کتابت میں منہمک ہو گئے۔ اور ان کی نقل میں باہم مقابلہ کی وجہ سے عربی خط کو فروغ ہو چلا۔

دیوان حکومت | بنی امیہ کے عہد میں وزیر مشرق حجاج بن یوسف کی کوشش سے اس کے ایک کارپرداز ابو صالح نے جو فارسی بھی جانتا تھا۔ ایرانی دفتر کو فارسی سے عربی میں منتقل کر لیا۔ اسی طرح ۸۱ھ میں سلیمان بن سعد نے رومی زبان سے ملک شام کے تمام سرکاری دفاتر کا عربی میں ترجمہ کیا۔ مصر کا دفتر عربی اور قبطی دونوں زبانوں میں رکھا گیا۔ ایک مدت کے بعد قبطی زبان کے ساتھ اس کا دفتر بھی فنا ہو گیا۔

دواوین حکومت کے عربی میں آ جانے کی وجہ سے جملہ مکاتب اور مدارس میں نہ صرف دینی بلکہ دنیاوی ضرورت سے بھی عربی خط کی تعلیم ہونے

گی۔ اور دنیا کی جن جن قوموں میں اسلام کی روشنی پہنچی۔ ان میں عربی خط مقبول ہوتا گیا۔ مشرق میں ملایا۔ اور جاوا سے لے کر مغرب میں بحیرۂ اڈریاٹک اور شمال میں حدود ترکستان اور وسط روس سے لے کر جنوب میں اقصائے زنجبار تک یہ خط پھیل گیا۔ اور ان تمام اقوام نے جو ان حدود میں بستی ہیں۔ اپنی اپنی زبانوں کو اسی خط میں لکھنا شروع کیا۔

اسلامی تمدن کی دوسری یادگاروں سے اگر قطع نظر بھی کریں تو عربی خط اس کی ایک ایسی مستحکم اور پختہ یادگار ہے۔ کہ اس کی مثال دنیا کی تاریخ میں نہیں مل سکتی۔ جو قومیں اسلامی تمدن میں داخل ہوئیں۔ ان میں سے بعض بعض نے عربی دین کے ساتھ عربی زبان اور عربی خط کو بھی اختیار کر لیا۔ مثلاً شام۔ عراق اور اکثر افریقہ کے باشندے۔

بعض بعض قوموں میں صرف دو ہی باتیں آئیں یعنی عربی دین اور عربی خط جیسے ترک۔ ایرانی۔ افغانی۔ ہندی۔ سندھی وغیرہ کسی قوم نے صرف عربی زبان اور عربی خط کو لیا۔ مثلاً ممالک اسلامیہ کی ذمی رعایا اور کسی نے صرف عربی دین پر قناعت کی عربی زبان اور عربی خط کو اختیار نہ کر سکی۔ جیسے چین کے مسلمان۔ لیکن باوجود اس کے عربی زبان اور عربی خط کی وہ لوگ دل سے عزت کرتے ہیں۔ اور اس کو متبرک اور مقدس سمجھتے ہیں۔ قرآن شریف اور دعائیں اسی زبان اور اسی خط میں لکھتے ہیں۔

الغرض جس طرح عربی زبان تمام دنیا کے مسلمانوں کی مذہبی زبان ہے۔ اسی طرح عربی خط تمام اسلامی زبانوں کا مشترکہ خط ہے۔

مردم شماری یورپ میں ترک اور تاتاری قوموں کی تعداد جن کی زبانیں عربی خط میں لکھی جاتی ہیں۔ دس ملین سے کم نہیں۔ ایشیا میں عربی خط میں کتابت کرنے والوں کی تعداد ۱۶۳ ملین سے زیادہ ہے۔ اور افریقہ میں تخمیناً ۷۰ ملین۔ دنیا کے دیگر ممالک میں اور بھی لاکھوں آدمی ہیں۔ جو اس شمار میں نہیں آئے لیکن وہ عربی میں کتابت کرتے ہیں۔ اب ان تینوں براعظم میں ان قوموں کی مجموعی تعداد جن کی زبانیں عربی خط میں لکھی جاتی ہیں ۲۴۳ ملین سے زیادہ ہے۔ یعنی تقریباً ۲۵ کروڑ۔ خلاصہ یہ ہے کہ عربی خط افریقہ میں غالب ایشیا میں شائع۔ یورپ میں مستقل اور امریکہ اور آسٹریا میں مشہور و معروف ہے۔

زبانوں کے لحاظ سے دیکھئے۔ تو سامی زبانوں کی تمام انواع پر خود عربی اس قدر غالب آ گئی۔ کہ اس نے ان کو یا تو فنا کر دیا یا تقریباً مردہ بنا دیا۔ اور ان کی جگہ خود لے لی۔

حامی زبانوں میں سے بھی اکثر زبانوں کو عربی نے فنا کر دیا۔ اب جو چند شاخیں اس کی باقی رہ گئی ہیں۔ ان میں سے سات زبانیں عربی خط میں لکھی جاتی ہیں۔

تورانی زبان کی اہم ترین شاخ ترکی ہے۔ اس کی تمام قسمیں عربی خط میں آگئیں۔

ایرانی زبانوں کی دو قسمیں ہیں جنوبی اور شمالی۔ جنوبی میں سے سوائے سنسکرت کے کہ وہ برہمنوں کی مذہبی زبان ہے۔ باقی اکثر عربی خط میں آگئیں۔ البتہ شمالی ایرانی جن میں یورپ اور امریکہ کی زبانیں داخل ہیں۔ یورپین خطوط میں لکھی جاتی ہیں۔

"جامعہ"

زندگی

کیا کیا فریب دے کے ستاتی ہے زندگی
ہر دم ہنسا ہنسا کے رُلاتی ہے زندگی

بیزار کیسے کوئی بھلا اس سے ہو سکے
انساں کو سو طرح سے لُبھاتی ہے زندگی

روٹھے جو ایک دفعہ دل اس سے تو لاکھ بار
دے کر فریب اس کو مناتی ہے زندگی

آئے جو کوئی پاس تو کہتی ہے "دُور ہو"
اور دُور ہو تو پاس بُلاتی ہے زندگی

ہنستا کسی کو پا کے رُلاتی ہے اشکِ خوں
روئے کوئی تو اس کو ہنساتی ہے زندگی

امیدوار دل ہو تو یہ توڑتی ہے آس
مایوس ہو تو آس بندھاتی ہے زندگی

کوئی ڈرائے اس کو تو ڈرتی ہے اس سے یہ
کوئی ڈرے تو اور ڈراتی ہے زندگی

عادی اگر ہو کوئی تو رہتی ہے یہ دبی
اور جو دبے تو اُس کو دباتی ہے زندگی

گرتا ہے خود ہی طائرِ دل آ کے سر کے بل
رنگین دام ایسا لگاتی ہے زندگی

گر کوئی ہوشیار نہ ہوتا ہو یوں شکار
حرص و ہوس کا جال بچھاتی ہے زندگی

اک عمر ڈھونڈھنے پہ بھی جن کی ملے نہ چھاؤں
کچھ ایسے سبز باغ دکھاتی ہے زندگی

پھر کر کے غم سے جان کی بنیاد کھوکھلی
گھُن کی طرح سے جسم کو کھاتی ہے زندگی

جب تک ہے سانس جسم میں ہے چھوٹنا محال
پنجے میں اپنے ایسا دباتی ہے زندگی

پورے کسی کے کرتی ہے لاکھوں تو بے شمار
ارمان خاک میں بھی ملاتی ہے زندگی

بے بال و پر کو قوتِ پرواز بخش کر
رفعت پہ آسماں کی بٹھاتی ہے زندگی

جو خاک پر ہیں اُن کو تو دیتی ہے اوجِ عرش
عرش پر ہیں اُن کو گراتی ہے زندگی

اہلِ ہوس کو تختِ جواہر نگار پر
کچھ دن بٹھا کے عیش کراتی ہے زندگی

پھر ایک دن گھسیٹ کے ان کو کشاں کشاں
فرشِ زمیں پہ لا کے سُلاتی ہے زندگی

لاکھوں ہی گھر مٹا کے بساتی ہے ایک گھر
سو جان لے کے ایک بناتی ہے زندگی

کتنوں کا خون چوس کے پلتی ہے ایک جان
حیرت ہے زندگی ہی کو کھاتی ہے زندگی

نیکی کسی کی ہو تو اُسے خاص طور پر
اک راز کی طرح سے چھپاتی ہے زندگی

اور ہو کہیں جو کوئی برائی تو دیکھئے
عالم میں ایک شور مچاتی ہے زندگی

قائم ہے کس طرح سے سروں پر یہ آسماں
منظر تو رات دن یہ دکھاتی ہے زندگی

مجھ کو یہ ڈر ہے طبقۂ عالم اُلٹ نہ جائے
دُنیا سے ذکرِ خیر مٹاتی ہے زندگی

مکار و حیلہ ساز سیہ کار و خود غرض
شیطان آدمی کو بناتی ہے زندگی

انساں عجب ہے طفلکِ ناداں جسے جلیل
جس راہ چاہتی ہے چلاتی ہے زندگی

"الناظر"

انگریزی

کیا تو جا رہی ہے؟

ابھی آئی ہے۔ ابھی جا رہی ہے؟
میں نہ مانوں گا۔ تیری جدائی مجھے مار ڈالے گی!
میں تیرے بغیر جی نہیں سکتا!
کیا تو جا رہی ہے؟
خدا کے لئے کر دے نہیں!
کیا تو اُسے چھوڑے جاتی ہے۔ جس نے تیرے لئے لمبی راتیں
آنکھوں میں کاٹی ہیں؟
کیا تو اُسے چھوڑے جاتی ہے۔ جس نے تیری یاد میں خون
کر کے آنسو روئے ہیں

کیا تو اُسے چھوڑے جاتی ہے۔ جس نے اپنا دل تیرے قدموں
پر رکھ دیا ہے؟
کیا تو جا رہی ہے؟
خدا کے لئے کر دے۔ نہیں!
کیا تیرے سینے میں دل نہیں، پتھر ہے؟
کیا تیرا دل ترس کھانا نہیں چاہتا؟
کیا تیری آنکھوں میں مروّت نہیں؟
کیا واقعی تو جا رہی ہے؟

میرا دل

میرا دل اس جگنو کی چڑیا کی طرح بے قرار ہے۔ جو دانہ ڈھونڈتی ہے۔ اور نہیں پاتی!
میرا دل اُس پرند کی طرح ہے۔ جو جگنو کا لوٹتا ہے۔ اور اپنا آشیانہ پانی میں ڈوبا ہوا پاتا ہے؟
میرا دل، سیب کا درخت ہے، جسے پالا مار گیا ہے!
میرا دل، سیپ ہے، جس سے موتی نکال لیا گیا ہے!
میرا دل سب سے بڑا ہے!
آسمان سے بھی اور عرشِ الٰہی سے بھی،
مگر یہ آباد دنیا، آج اجاڑ ہے،
اُس کے کھنڈروں میں اُلّو بول رہے ہیں،
کیونکہ وہ چلی گئی ہے،
خدا اُس سنگ دل کو سمجھے!

"ہند"

فرانسیسی

طوفان

آہ کیسی خوشی سے ہم جہاز پر بیٹھے۔ اور دوستوں سے گلے مل مل کر ساحل سے رخصت ہوئے تھے۔ کوئی مسافر نہ تھا۔ جو فرحان و شاداں نہ ہو۔ ہوا موافق تھی۔ جہاز ہنستا کھیلتا چلا جا رہا تھا۔ مگر بے رحم تقدیر کی پیشانی پر بل پڑے ہوئے تھے۔

رات اندھیری تھی۔ اُودی گھٹائیں اُمنڈ آئیں جن میں بجلیاں چھپی تھیں آندھی شروع ہوئی۔ ہر طرف شور تھا۔ سائیں سائیں کی ہیبت آواز یں دلوں کو لرزائے ڈالتی تھیں۔ جہاز کے قدم اکھڑنے لگے۔ زلزلہ سا پڑ گیا۔ مسافروں کے ہاتھ سینے تھامے تھے مگر موجیں جہاز کو اپنے کاندھوں پر اٹھا چکی تھیں۔ ہوا کے تھپیڑوں نے موجوں کو توڑ ڈالا۔ جہاز، سوکھے پتے کی طرح اڑنے لگا ـــــــ ہولناک دھماکا! سب غرق!

میری ماں کے دل! خدا حافظ کہتا ہوں۔ تو مجھے یاد کرے گا۔ اور خون کے فوارے تجھ سے جاری ہو جائیں گے! تو میرا انتظار کرے گا۔ مگر تیرے لعل کو تو سمندر نگل چکا ہے! ہائے میرے خدا، ماں کا دل کس طرح قرار پائے گا؟

بے رحم طوفان! تو نے نہ میری ماں پر ترس کھایا، نہ میری جوانی پر، نہ میرے ارمانوں پر! خود میں بھی اپنے دل میں تجھ سے بڑا طوفان رکھتا تھا، مگر افسوس میں غرق ہو گیا۔ اور دنیا میرا طوفان دیکھ نہ سکی ـــــــ سناٹا!

اپنا راز تجھے بتاتا ہوں

مَیں جانتا ہوں کہ تجھے خط لکھنے کا مجھے کوئی حق نہیں ہے۔
تیری محبت کی جنت میں عجیب مستی مجھ پر چھائی ہوئی تھی۔
مَیں چاہتا تھا۔ میرا راز دل ہی میں رہے۔
مگر اس راز کے بوجھ سے میرا سینہ پھٹا جاتا تھا!
آہ، میری سادہ لوحی!
رقص کے جلسہ میں چند ہی لمحے تو ہم ساتھ تھے۔
مَیں کیا جانتا تھا۔ کہ آنکھیں چار ہوتے ہی قیامت آ جائے گی!
میرے سینے میں آتش فشاں پھٹ پڑے گا!
مَیں غیب جانتا، تو اپنی نگاہیں چرا لیتا۔
مَیں غیب جانتا، تو رقص گاہ سے بھاگ نکلتا۔
مَیں غیب جانتا، تو کبھی تیری صورت نہ دیکھتا۔
او جادوگر! او فرشتوں کو بھی چھل دینے والے!
کوئی بھی اپنا دشمن ہوتا ہے؟
کوئی بھی آرام دے کر تکلیف مول لیتا ہے؟
کوئی بھی اپنا دل ذبح کرتا ہے؟
تو نے پہلی ہی نظر میں جادو کر دیا۔ اور میں دیوانہ ہو گیا!
بتا، قصور کس کا ہے؟
اللہ جانتا ہے۔ بے قصور ہوں۔ معصوم ہوں!
تو نے ہی جال بچھایا اور مجھے پھانس لیا۔
پھنس جانے پر بھی میں خوش تھا!
قید کسے پسند ہے؟
لیکن تیری سنہری زلفوں کی زنجیریں مجھے پیاری ہیں۔
تیری محبت کا قید خانہ، میری نظر میں فردوسِ بریں ہے!
مگر میرا راز، آہ میرا راز، دل کی پھانس ہے۔
میں یہ بوجھ کیسے اٹھائے رہوں؟
میرا سینہ پھٹا جاتا، اور پیٹھ جھکی جاتی ہے۔
اے وہ جسے اللہ نے اپنے جمال سے بنایا ہے۔
اے وہ جس سے حوریں شرماتی ہیں۔
میں تجھ پر عاشق ہوں!
یہ میرا راز ہے۔
تجھے اپنا راز بتاتا ہوں۔
مجھے مار ڈال یا اپنے آغوش میں زندہ رکھ!

نقد و نظر

راگ سکھشا

یہ کتاب شیخ خادم محی الدین صاحب لیکچرار گورنمنٹ کالج لائلپور نے راگ سیکھنے والوں کی آسانی کے لئے لکھی ہے۔ اس میں ہندی راگ کے پچاس ابتدائی اسباق متعلقہ سُر اور تال دیئے گئے ہیں۔ شیخ صاحب نے اس کتاب کو تعلیمی نقطۂ نظر سے لکھا ہے۔ اور اس حیثیت سے اس فن کی اہمیت کا اندازہ کرتے ہوئے اُسے ایک مضمون کے طور پر پیش کیا ہے۔ اگرچہ موسیقی ایک ایسا فن ہے جسے استادؔ کی مدد کے بغیر انسان کماحقہٗ حاصل نہیں کر سکتا۔ تاہم اس کتاب کا اسلوبِ تحریر ایسا ہے۔ کہ یہ شائقینِ موسیقی کو اس سے کافی مدد مل سکتی ہے۔ اس میں راگ سیکھنے کے مختلف طریقے بتائے گئے ہیں۔ اور اسباق کے ساتھ مشقیں دے کر کتاب کو زیادہ مفید بنا دیا ہے۔ حجم ۱۲۰ صفحات قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے۔ ملنے کا پتہ:- محمد نصیر ہمایوں بی۔ اے مینیجر قومی کتب خانہ۔ ریلوے روڈ لاہور۔

حقیقتِ حج

یہ ضخیم کتاب خانصاحب حاجی منظور علی صاحب مالک آرمی پریس شملہ نے فریضۂ حج کے متعلق اپنے ذاتی تجربات و مشاہدات کی بنا پر لکھی ہے۔ اس میں حج کی حقیقت، مقامات و اماکنِ مقدسہ کے حالات اور سفر وغیرہ کے متعلق معلومات و ہدایات نہایت تفصیل کے ساتھ درج ہیں۔ کتاب کے آغاز میں ارکانِ اسلام پر فلسفیانہ انداز میں بحث کی ہے۔ اس کے علاوہ مسلمانوں کی سیاسی، مذہبی اور معاشرتی حالت پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ حج کے متعلق کئی ایک کتابیں لکھی جا چکی ہیں لیکن "حقیقتِ حج" جیسی جامع کتاب جو نہ صرف اس مقدس سفر کی تفصیلات پر مشتمل ہے۔ بلکہ جس میں دینی معلومات کا بھی ایک بے بہا ذخیرہ موجود ہے اب تک ہماری نظر سے نہیں گزری۔ حجم پانچ سو صفحات۔ قیمت ایک روپیہ۔ قسم اعلیٰ دو روپے۔ مصنف موصوف سے طلب فرمائیے۔

دردِ زندگی

حضرتِ احسان بن دانش کا ایک مجموعۂ کلام "حدیثِ ادب" کے نام سے چھپ کر مقبول ہو چکا ہے۔ "دردِ زندگی" میں بھی وہی زورِ کلام نظر آتا ہے۔ حضرتِ احسان کا ایک نمایاں وصف یہ ہے۔ کہ ان کی نگاہ زندگی کے نشیب و فراز پر اس طرح حاوی ہے۔ کہ معمولی سے معمولی چیز بھی ان سے چھپی نہیں رہتی۔ جہاں انہوں نے "پولین" اور "دُنیا" جیسے بلند مضامین پر طبع آزمائی کی ہے۔ وہاں فقدانِ معاش اور ڈاکٹر اقبال کی کوٹھی کو بھی فراموش نہیں کیا۔ "دردِ زندگی" میں غربا کی پُرآشوب اور دردناک زندگی کی تصویریں جابجا نظر آتی ہیں۔ حضرتِ احسان کو اگر ہندوستان کے مصیبت زدہ طبقہ کا ترجمان کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ وہ دنیا کی اُن چیزوں کا بغور مشاہدہ کرتے ہیں جو کس مپرسی کی حالت میں ہیں۔ اور شعرا نے جنہیں آج تک حقیر سمجھ کر نظر اٹھا کر بھی دیکھنا گوارا نہیں کیا۔ حضرتِ احسان نے ان چیزوں کو اپنی شاعری کا موضوع بنا کر ان میں حسن پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ اور اسی طرح شاعری کے دائرے کی توسیع کرنے پر ایک حد تک کامیاب بھی ہو گئے ہیں۔ ممکن ہے کہ نازک طبع حضرات احسان صاحب کے بعض مشاہداتؔ کو درخورِ اعتنا نہ سمجھیں۔ اور "دردِ زندگی" کے بعض حصے مذاقِ سلیم پر گراں گزریں لیکن چونکہ کتاب کی طباعت ان کی نظرِ ثانی کے بغیر ہوئی ہے۔ اس لئے بعض زبان کی خامیوں کی بنا پر انہیں قابلِ گرفت نہیں سمجھا جا سکتا، حجم سوا تین سو صفحات سے زائد۔ قیمت دو روپے۔ ذیشان بُک ڈپو۔ مزنگ۔ لاہور سے منگائیے۔

ہند

کلکتہ سے یہ ہفتہ وار مصور پرچہ مولانا عبد الرزاق صاحب ملیح آبادی کے زیرِ ادارت نہایت خوش اسلوبی سے نکل رہا ہے۔ ہر ہفتے اس میں اعلیٰ درجے کے سیاسی علمی، ادبی اور معاشرتی مضامین شائع ہوتے ہیں۔ ہمارے خیال میں اس اخبار کو "الہلال" کا نعم البدل سمجھنا چاہیئے۔ حجم ۲۴ صفحات۔ سالانہ چندہ پانچ روپے۔ ایک پرچے کی قیمت چھ پیسے۔ ملنے کا پتہ۔ منیجر اخبار ہفتہ وار "ہند" نمبر ۲۸ اے چترنجن ایونیو۔ کلکتہ۔

ماہِ تمام

اس ماہوار رسالے کے اب تک چار پرچے ہماری نظر سے گزر چکے ہیں اب تک جتنے مضامین شائع ہوئے ہیں۔ وہ دلچسپ، مفید اور متنوع ہیں۔ اس کے ایڈیٹر جناب محمد اسحٰق صاحب امرتسری خود ایک اچھے ادیب ہیں۔ اور جن اصحاب نے ان کی تحریر پڑھی ہے۔ وہ ان کی سلامتِ ذوق کے معترف ہوں گے حجم ۴۸ صفحات قیمت سالانہ چار روپے۔ پتہ۔ منیجر رسالہ ماہِ تمام۔ نمبر ۲ سری ناتھ بابو لین۔ کلکتہ۔

منصور احمد